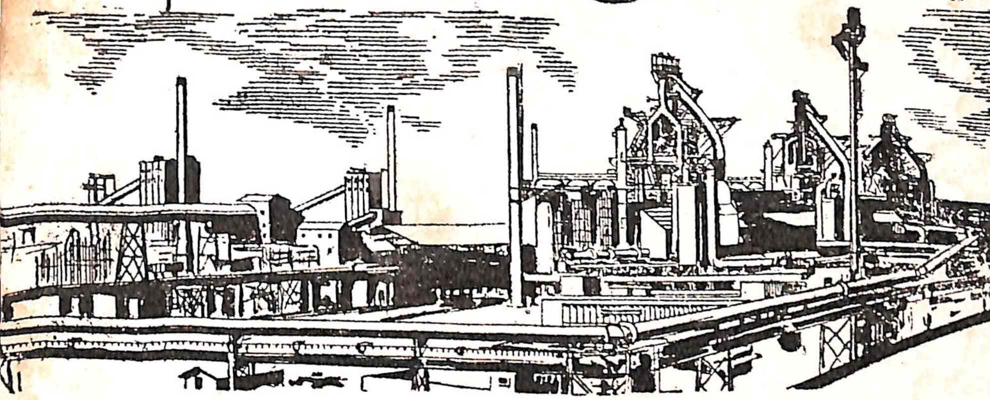

11

دِفاع اور



ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

ملک کے ترقیاتی منصوبے ملکی دفاع کا اہم جز ہیں ۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر اب نئی ترجیحات مقرر کی گئی ہیں ۔ انجینیئری اور طبی علمے کی تربیت، پھوٹی اسکیموں، اور فولاد، کشین، مشینی اوزار، بجلی کا ساز و سامان، کوئلے کی کان کنی اور ریلوے جیسی بنیادی صنعتوں کے ترقیاتی پروگراموں پر تیزی سے عمل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے ۔

طاقت کی ٹھوس بنیاد پر ہی دفاع کی تیاری کا انحصار ہے ۔ ہمارے مسئلے کا ایک یہی حل ہے ۔

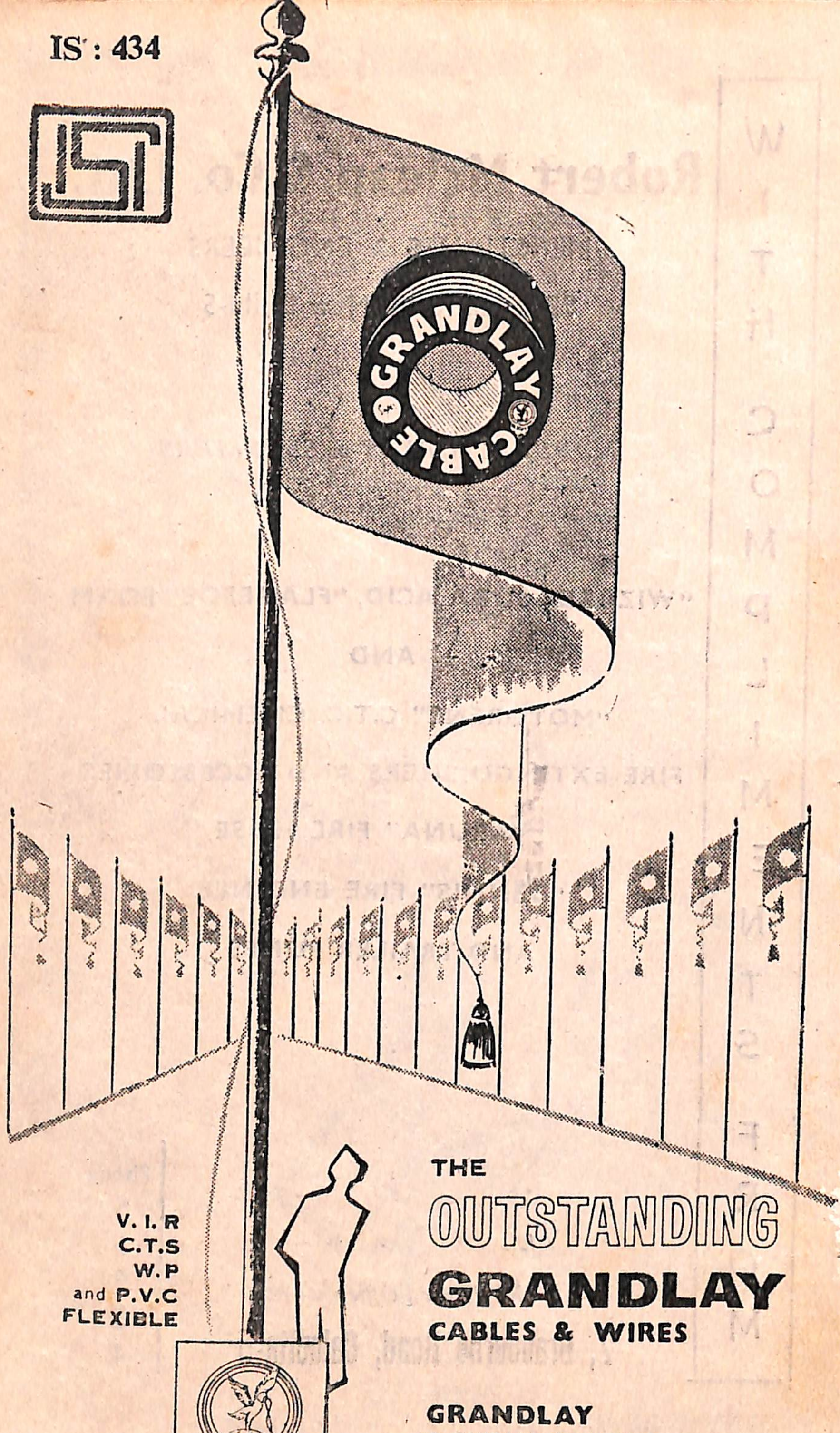
اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹائیں ۔ کروڑوں جیالوں کی بے غرض خدمت اور ان تھک کوشش کی بدولت ہی بھارت اپنی دفاعی طاقت کو بڑھا سکتا ہے ۔



پلان کو
کامیاب
بنایئے

بھارت کے دِفاع کو
مضبوط کیجئے

DA 63/


IS : 434
ISI
GRANDLAY CABLE
V. I. R
C.T.S
W.P
and P.V.C
FLEXIBLE
THE
OUTSTANDING
GRANDLAY
CABLES & WIRES
G.E.I
GRANDLAY
ELECTRICALS (INDIA)
SADAR THANA ROAD, DELHI-6

دو ماہی

محور

دہلی

گیارھواں شمارہ

نگراں : منوّر لکھنوی

ادارۂ تحریر

باقر مہدی

نریندر نشچل

فی شمارہ : ایک روپیہ

سالانہ : چھ روپیہ

دفاتر

دہلی ۔ ۱۲/۱۶ اے ویسٹرن ایکسٹینشن ایریا نئی دہلی ۵

بمبئی ۔ ۱۰۸ اولین بمبئی نمبر (۵ ۵)

اس شمارے میں

باقر مہدی — ادبی میزان

افسانہ، طنزیہ

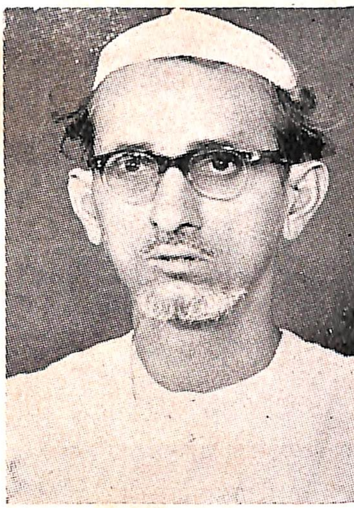
نظمیں

مضامین

غزلیں



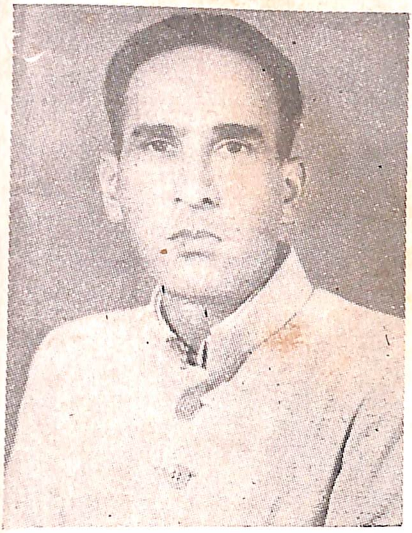
ژین پال سارتر



رزم ردولوی



جمیل جالبی



خلیل الرحمٰن اعظمی



رضا ہمدانی



اختر ہوشیارپوری

باقر مہدی

ادبی میزان

جن تنقیدی تاثرات کا اظہار آج کل مضامین میں کیا جا رہا ہے ان کی نوعیت بڑی دلچسپ ہے ایک طرف تو پیشہ وار نقاد کو مطعون کیا جاتا ہے اور دوسری طرف نہایت معصومانہ انداز میں تلخ باتیں کہنے کی مشق کی جا رہی ہے یہاں نام گنوانے کا موقع نہیں ہے مگر یہ بات اپنی جگہ خود کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو "لطیفے" کی حد سے آگے نہیں جاتی — کسی قسم کے تاثرات کے اظہار سے پہلے اس فن کے بارے میں بنیادی باتیں معلوم کر لینا ضروری ہے۔

کیا ان مضامین کو تنقید کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے جن پر صرف منطقی استدلال کا فقدان ہی نہیں ہوتا بلکہ تاثرات کا بھی واضح اظہار نہیں ہوتا — یہ صحیح ہے کہ ہر شخص کو اپنے "خیالات" کا اظہار کرنا چاہیئے مگر اس پر مُصر ہونا غلط ہوگا۔ نثر لکھنا خاصا مشکل فن ہے اس کے حصول کی کوشش ایک عمر چاہتی ہے مگر اردو کی یہ خامی بڑی پرانی ہے یہاں بات کہنے کے انداز پر نہیں بات پر شروع سے زور دیا گیا ہے اور بیشتر "ناقدین" کے مضامین آج دوبارہ مطالعہ کے لائق کم ہی ہیں۔ صاف، شگفتہ، پراثر اور باوقار تحریر بڑی جستجو کے بعد ہی ملے گی —

اسلئے آج کے مضامین کو "خیالات پریشان" کا عنوان بھی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ خیالات کے بیان کے لئے جس ذہنی بلندی اور علمی گہرائی کی ضرورت ہے وہ اس دور کو کم ہی نصیب ہے شاید پچھلے دور کو بھی نصیب نہ تھی۔

پچھلے چند ماہ میں جو چند مضامین تھوڑی بہت توجہ کے مستحق ہیں ان میں راہی معصوم رضا کا مضمون "نیا ادب اور پرانی کسوٹی" ایک "نئے سرکشی" کا پہلا قدم معلوم ہوتا ہے۔ راہی کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ وہ نئی نسل سے بہت الگ تھلگ ترقی پسندی کے بکھرے ہوئے کارواں میں تنہا رہ گئے ہیں اور کسی نہ کسی طرح اس "روش" پر ہی چلتے رہنا مناسب سمجھتے ہیں ان کی باتوں میں تھوڑی بہت صداقت بھی تھی (مکمل صداقت کی تلاش ایک آئیڈل سہی مگر ———) میں نے ان کے مضامین "عوامی دور" میں خاصی دلچسپی سے پڑھے تھے وہ آفاق حیدر کے قلمی نام سے "ترقی پسندوں کی بچی کچی پونجی" کو لٹنے سے بچانا چاہتے تھے مگر افسوس کہ انھیں تھوڑی بہت کامیابی بھی نصیب نہ ہوئی — اور آخر اس مضمون سے وہ بھی ترقی پسندی کا ساتھ چھوڑ گئے۔ (ان سے برسوں پہلے پبلو نرودا جیسا شاعر بھی آخری سلام کر چکا ہے اور اس فہرست میں کتنے ہی پولش اور دوسرے مشرقی یورپی جمہوریت کے ادیب و شاعر شامل ہیں) — مگر انھوں نے اس مضمون میں جو باتیں کہی ہیں وہ دلچسپ ہونے کے باوجود خاصی سطحی ہیں ظاہر ہے یہ پہلا قدم ہے اس لئے ان کی آواز میں سرکشوں کی وہ گرمی اور گہرائی نہیں ہے جس کا ذکر کامیو نے اپنی کتاب "باغی" THE REBEL میں کیا ہے۔

انھوں نے شروع میں تنقید اور ناقدین کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ بیحد بحث طلب ہے۔ ہر عہد کے نقاد کا کام اقدار کی تلاش اور اس کسوٹی پر نئے ادب کا جائزہ ہے — شاید انھوں نے اقدار جیسے گمبھیر لفظ کا استعمال روا روی میں کیا ہے ادب کا نقاد اقدار کی تشکیل کیسے کرتا ہے؟ کیا ان اقدار کی تلاش اسے زندگی کے دوسرے شعبوں میں نہیں لے جاتی جیسے فلسفہ اور وہ اس "جنگل" میں پہنچ کر اور "گمراہ" نہیں ہو سکتا — میری ناچیز رائے میں (جو سراسر غلط بھی ہو سکتی ہے یہ خاکساری نہیں ہے اظہار حقیقت ہے اگر اس دور میں "حقیقت" کے معنی زندہ ہوں) ادبی اقدار کی تشکیل میں بارہا ایک غلطی دونوں طرف ہوئی ہے جمالیاتی نقطۂ نظر والوں نے اسے الفاظ کی صوتی شکلوں میں ڈھالنے کو ہی سب کچھ سمجھا اور دوسری طرف زندگی کی ایک ہی جڑ یعنی معاشیات ہی کو بنیاد بنایا گیا۔ اور اس طرح نقادوں کو یہ کام تقسیم کیا گیا کہ وہ "بیچارے" اقدار تلاش کر کے لائیں اور "فنکاروں کی تعریف" کریں کیونکہ دوسری صورت میں وہ ناقد نہیں اور یا یہ فنکار نہیں —

شاید راہی کو اس بات کا اندازہ کم ہے کہ آج اقدار کی تلاش میں فلسفی پہلے سے کہیں زیادہ "مبتلائے عذاب" ہیں سارتر تو ایسا باشعور (یہ ترقی پسندوں کا محبوب لفظ ہے جو مجھے اب تک پسند ہے) ادیب و مفکر یہ نہیں طے کر پایا ہے کہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی کی شکست و ریخت میں کس قدر کو اولیت دے اس نے بڑی ایمانداری سے اپنے ذہنی الجھاؤ کا اظہار ایک انٹرویو میں کیا ہے (یہ این کاونٹر جون ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے) جس میں یہ بات کھلے الفاظ میں کہی ہے کہ اس وقت نہ کوئی راہ فرار ہے اور نہ راہ نجات۔

اس لئے "زندگی کے جہنم زار" میں اقدار کی تلاش نہایت مستحسن اقدام کے باوجود صرف نقاد کا مقسوم نہیں ہے اس کی جستجو میں ہم سب "گمراہ ہیں" — راہی کے مضمون میں توازن کی بڑی کمی ہے وہ مضمون کو دلچسپ بنانے کے لئے درزی کی دکان میں بھی گھومتے رہے ہیں جبکہ نقادوں پر "دریوزہ گری" کا الزام عائد کرتے ہیں۔ انھوں نے وہ غلطی بھی کی ہے جو سپنڈر نے اپنی کتاب THE STRUGGLE OF MODERN میں کی ہے۔ یعنی ادیبوں کی تقسیم نئے اور پرانے میں عمروں کے لحاظ سے — ایسی تقسیم کے لئے مجتبیٰ حسین نے بے حد چبھتا ہوا جملہ کہا تھا "ادب میں عجائب خانے نہیں پائے جاتے جہاں پرانی نسل کے ادیبوں کی تخلیقات رکھی جاتی رہیں —" انھیں "سجاد ظہیر ایسے ذمہ دار لوگ" سے شکایت ہے کہ وہ صرف چند ترقی پسندوں کا نام لیتے ہیں اور بس — ذمہ دار لوگوں کی تعداد تو بہت ہے لیکن عصر حاضر کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والوں کا فقدان ہے۔ انھوں نے ترقی پسند ادب کے بنیادی نعروں پر سوالیہ نشانات نہیں لگائے ہیں اسی لئے اپنی تحریر میں نقصان ایسا مہمل لفظ استعمال کیا ہے ("نقصان ہوتا ہے خود ناقدین کا عام پڑھنے والوں کا" راہی کے الفاظ) شاید وہ ایک لمحہ کے لئے یہ بھول گئے کہ ادب کی تخلیق تو "جرأت رندانہ اور شوق فضول" کا ہی نتیجہ ہے اس کو سود و زیاں کے پیمانوں سے کیا سروکار — یہ تو ایک فرد کی ذہنی کشمکش اور "روحانی عذاب" کے اظہار کا ذریعہ ہے جو وہ سماج سے اپنے رشتے استوار کرنے کے سلسلے میں کرتا رہتا ہے اور آج کے دور میں "سب سے بڑا ستم" تو یہی ہے کہ سارے کلئے توڑنے والا کلیہ بھی بن گیا ہے انھوں نے بڑی معصومیت سے ان ساری باتوں کا اظہار کر دیا ہے جو وہ کئی ادبی مضامین میں آئندہ کرنا چاہتے ہوں گے مثلاً ماضی حال اور مستقبل کے مسائل معاشیاتی مباحث، عمرانی نقطۂ نظر وغیرہ وغیرہ — نئے ادیب کو حصر میں مقید نہیں کیا جا سکتا ورنہ اختر الایمان کے یہ چند مصرع جو میری رائے میں آج کے شاعر کی بڑی حد تک ترجمانی کرتے ہیں پہ نہ

کہلائیں گے کیونکہ وہ عمر کے لحاظ سے "بزرگوں" میں شامل ہیں مگر شعری خیالات کی وجہ سے جدید شاعری کے رازداں ہیں ؎

"مجھے کوئی مکتی نہیں چاہئے کوئی نروان کی آرزو کوئی خواہش، تمنا
کوئی سلسبیل اور کوثر، نجات و جزا، پرسکوں کوئی لمحہ
نہیں — صرف امواج کی شورش رائیگاں چاہئے، یہ اگر رائیگاں ہے"
(نظم لوگو اے لوگو کے آخری تین مصرع)

اس مضمون میں وہ غیر شعوری طور سے اخترالایمان کا نام تک لینا بھول گئے ہیں — بہرحال یہ مضمون چھوٹے پیمانے پر ہی سہی مگر "سرکشی کا پہلا قدم" ضرور ہے اور کسی بھی رنگ کا سرکش ہو مجھے عزیز ہے — اس لئے کہ ؏ کسے کہ "باغی" نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ایک نئے مضمون نگار کریم الدین احمد (جنھیں حال ہی میں امیر مینائی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے) سیپ نمبر ۲۱ میں جدید شاعری کو "ہدفِ ملامت" بنایا ہے مگر اسے صرف پاکستان کے چند جدید شاعروں تک محدود رکھا ہے انھوں نے ترقی پسندوں کے انداز کا مضمون لکھا ہے لیکن کئی صحیح باتیں کہی ہیں گو کہ وہ نئی نہیں ہیں یہی کہ جدید شاعر نہ تو اپنے ادب سے پوری طرح واقف ہیں اور نہ انگریزی ادب سے اور تجربے کرنے پر مصر ہے ظاہر ہے کہ یہ بات ہر جدید شاعر کے لئے نہیں کہی جا سکتی البتہ انھوں نے محمد حسن عسکری کی فرانسیسی کا مذاق اڑایا ہے اور اپنے ذاتی تجربے سے لکھا ہے کہ انھیں فرانسیسی نہیں آتی — اور یہ بات انھیں ۵۵ء میں فرانس کے کلچرل اتاشی نے بتائی تھی — ان کی باتوں میں وزن ضرور ہے البتہ وہ ادب میں تاج محل بنانے کو اچھا ادیب سمجھتے ہیں جو کہ اب ممکن نہیں ہے ان کے مضمون کی بنیادی خامی (میری ناچیز رائے میں) یہ ہے کہ انھوں نے یورپ کی "بے معنویت اور خلا" کو صرف فرانس تک محدود رکھا ہے اور اس طرح جغرافیائی حدود میں ادب کی تاثیر کو قید نہیں کیا جا سکتا ہے اس کا اثر تو ہر زبان پر شدت سے ہوا ہے اور جب ہی تو جدید روسی شاعر کہتا ہے ؎

وقت نے ہم پر تھوکا ہے
ہم بھی وقت پر تھوکیں گے

(گو یہ مصرعے خاصے بھونڈے ہیں مگر صرف مثال کے لئے پیش کئے جا رہے ہیں) — میں ان سے جس نکتے پر اپنے کو متفق پاتا ہوں وہ ہے جدید شاعری میں ابلاغ کی مذمت — جس کی اچھی مثال افتخار جالب کی نئی نظم میں مل جائے گا۔

یہ نظم سات رنگ کے نئے شمارے میں شامل ہے نظم کا عنوان "ذات کا نشۂ نفاذ ہوگا"۔ نہایت بھونڈا اور بے کیف ہے یہ نظم تو کئی بار پڑھنے کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے مگر زبان میں یہ تجربہ کیا رنگ لائے گا۔ کیا ہر پابندی سے آزادی ایک نئی طرح کی قید نہیں ہے؟ (SAUL BELLON کا ناول THE DANGLING MAN ملاحظہ ہو) ــــ وجودیت کے منوانے والے شاعر ابلاغ کا بھی کچھ خیال رکھتے ہیں اس سلسلے میں ALAIN BOSQUET کی نظم THE FORGOTTEN KINGDOM اعلیٰ پائے کی نظم ہے اس کی امیجری جدید ہی نہیں ہے بلکہ بہت سی شعری خوبیوں کی حامل ہے۔ تاثر، نغمہ، اور ابلاغ سے خالی شاعری نہ تو جدید کے خانے میں آتی ہے اور نہ قدیم کے ــــ افتخار جالب سے مجھے گفتگو کرنے کا موقع لاہور میں ملا تھا اور وہاں انھوں نے جو نظمیں سنائی تھیں ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا مگر ان کی یہ نظم تو ہر ایک خوبی سے خالی ہے شاید ادب میں "تجربہ" کے خانے میں آئے تو آئے ورنہ وہاں بھی اس کا زیادہ دیر ٹھہرنا مشکل ہے۔ شاید ایسی نظموں کو پیش نظر رکھ کر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے "شہر آشوب" میں جدید شاعری کا مذاق اڑایا تھا (ایک بات اور کہنے کو دل چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ادھر ان کی جدید شاعری سے رغبت بہت کم ہوتی جا رہی ہے جب کہ ان کی "نئی دقیانوسی غزلوں" سے ظاہر ہوتا ہے اور سابق ترقی پسند شاعر راہی کی پیاس بڑھتی جا رہی ہے جیسا کہ ان کی نئی نظموں سے ظاہر ہے ــ وحید اختر کی بات الگ ہے وہ قدیم رنگ کی نظمیں بھی کہتے اور آزاد نظمیں بھی یعنی ایک پاؤں یہاں ہے اور دوسرا ــــ

افتخار جالب نے ایک افسانہ "اصحاب کہف اور کتا" کا تعارف لکھتے ہوئے اختر الایمان پر بلاوجہ "رکیک حملہ" کیا ہے۔ اس بات کا یہاں کوئی موقع نہ تھا اختر الایمان کی "سپاٹ علامت نگاری" (افتخار جالب کے الفاظ) کا اصحاب کہف سے اتنا ہی تعلق ہے کہ انھوں نے دونوں کی "خاطر" نہیں کی تھی اور یہ کہہ کر دامن چھوڑ لیا تھا ؎

وہ سایہ دار شجر جو ساتھ راہ میں ہیں
سب آندھیوں نے گرا ڈالے اب کدھر جائیں
یہ بوجھ اب نہیں اٹھتا کوئی سبیل کرو
چلو ہنسیں گے کہیں بیٹھ کر زمانے پر

کرشن چندر

دیوناٹیک کے خطوط مہاراج اندر راج کے نام

۹، راج دوت ہوٹل
ڈپلومیٹک انیکلیو، نئی دہلی
۱۰ اگست ۱۹۶۳ء

دیوناٹیک مہاراج اندر دیوجی!

پرنام سوئیکار ہو۔ آپکے چرنوں کا داس، مورخہ نو جولائی ۶۳ء کو سورگ سے راکٹ پر سوار ہوکر نو کروڑ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اڑ کر آج پورے ایک ماہ ایک دن کے بعد نئی دلی پہنچا ہے۔ سفر میں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ کی دی ہوئی وہسکی جسے سورگ میں آنے والے بھارتی سمگل کر کے لائے تھے اور جسے آپ کے حکم سے ضبط کر لیا گیا تھا۔ اس وہسکی نے اس طویل سفر کو بہت خوشگوار بنا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سورگ میں اگر بھنے ہوئے ستو کے علاوہ تھوڑی سی وہسکی بھی بھگتوں کو مل جایا کرے تو بھگوان کے گن گاتے اور اپنا من بہلانے میں بہت مدد مل سکے گی۔ یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں!

میں یہاں راجدوت ہوٹل میں ٹھہرا ہوں جو ڈپلومیٹک انیکلیو میں واقع ہے۔ یہاں پر صرف بدیسی ملکوں کے راجدوت ٹھہرتے ہیں اور سورگ بھی چونکہ اس دنیا کے لئے ایک طرح کا بدیسی ملک ہے اس لئے مجھے بھی آپ کے راجدوت ہونے کے کارن اس شاندار ہوٹل میں جگہ مل گئی ہے۔ ہوائی اڈے پر مجھے

لینے کے لئے شری نہرو، مرارجی ڈیسائی، گلزاری لال نندہ اور ایس۔ کے۔ پاٹل موجود تھے۔ ان سب لوگوں نے مجھ سے پوچھا: "سورگ کیسا دیس ہے؟" میں نے کہا: "جاکر دیکھئے!" اس کے بعد کوئی کچھ نہیں بولا۔ میرا خیال ہے ان لوگوں کو شبہ ہے کہ میں سورگ سے نہیں آیا۔ کہتے ہیں وہاں جو جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا۔ میں نے کہا: "میں دیوؤں کے دیو شہنشاہِ ہفت اقلیم چکرورتی مہاراج اندر کا سفیر ہوں اور سیدھا سورگ سے آیا ہوں۔ مگر معلوم ہوتا ہے میرے جواب سے ان کی تسلی نہیں ہوئی۔ انھوں نے مجھے راجدوت ہوٹل میں جگہ تو دے دی ہے مگر میرے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی بھی لگادی ہے۔ یہ لوگ ہوائی اڈے پر کھڑے میرے حیرت انگیز راکٹ کو دیکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ میں سورگ کے بجائے کسی دوسرے ستارے سے آیا ہوں۔

شام کے چھ بجے میں نہا دھو کر اور لانڈری سے دُھلی ہوئی شفاف دھوتی پہن کر اور ماتھے پر چندن کا تلک لگا کر ہاتھ میں ایک کمنڈل لئے پوجا کے لئے نکلا۔ اور نیچے کونٹر پر جاکر میں نے کلرک سے کسی مندر کا پتہ دریافت کیا۔ تو وہ میرا سوال سن کر ہنسنے لگا۔ پھر بولا: "اس علاقے میں دور دور تک کوئی مندر نہیں ہے!"

"کیا کہتے ہو؟" میں نے گرج کر اس سے کہا: "یہ بھارت ہے، دھرم کی بھومی میرا، تلسی، سور داس اور والمیک کا جنم استھان۔ یہاں پر مندروں کی کیا کمی ہو سکتی ہے؟"

وہ بولا: "یہ ڈپلومیٹک انکلیو ہے۔ یہاں پر کوئی مندر نہیں ہے۔"

"تو میں پوجا کے لئے کہاں جاؤں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

بولا: "ایک نائٹ کلب ہے اس میں جائیے!"

میں خفا ہو کر واپس اپنے کمرے میں چلا آیا اور وہسکی پینے لگا کہ وہسکی سے دل کا غم ہلکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک ذاتی تجربہ ہے۔

کل صبح ناشتے پر پنڈت نہرو سے ملاقات ہے۔ اس کا حال کل لکھوں گا۔

چرنوں کا داس

دیورتن

نئی دہلی

۱۱ر اگست ۲۰۶۳ء

آج صبح ناشتے پر پنڈت نہرو سے ملاقات ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا۔ میں نے بتایا کہ سورگ میں آنے والے ہندوستانیوں نے شکایت کی ہے کہ بھارت کی دھارمک اوستھا اس وقت گہرے سنکٹ میں ہے۔ لوگ اپنا دھرم ایمان بھول چکے ہیں، اپنے بھگوان کو یاد نہیں کرتے۔ اور دن رات منافع خوری، رشوت خوری اور خویش پروری میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اس سے مہاراج اندر کو بہت تشویش پیدا ہوئی اور انھوں نے مجھے بطور خاص اس امر کی تحقیق اور تفتیش کے لئے بھارت میں بھیجا ہے!

پنڈت نہرو نے میری باتیں سن کر کہا: "دھارمک اوستھا کے سلسلے میں میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا، آپ شری گلزاری لال نندہ سے ملئے۔ جو شاید بھارتیہ سادھو سماج کے پریذیڈینٹ ہیں یا رہ چکے ہیں اور مارل ری آرمامینٹ تحریک سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں یا رکھتے تھے، وہ ممکن ہے آپ کو کچھ اس بارے میں شاید کیا کچھ بتا سکیں نہ بتا سکیں میں کچھ کہہ نہیں سکتا! ویسے یہ معاملہ بہت گھمبیر ہے مگر اس سے بھی زیادہ گھمبیر مسئلے میرے ملک میں موجود ہیں اور رہے اور شاید ممکن ہے آئندہ چل کر بھی رہیں کچھ کہہ نہیں سکتا!"

"بہت بہتر" میں نے آملیٹ کھاتے ہوئے جواب دیا۔

پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ پنڈت جی نے پوچھا: "سورگ میں لوہے کے کارخانے کتنے ہیں؟"

میں نے کہا: "ایک بھی نہیں!"

پوچھا: "لوگ کھاتے کیا ہیں؟"

میں نے کہا: "کچھ بھی نہیں!"

بولے: "وہاں کا پرائم منسٹر کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں!"

حیران ہو کر بولے: "پھر کام کیسے چلتا ہے؟"

میں نے کہا: "وہاں کام ہوتا ہی نہیں!"

مسکرائے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولے: "تو وہاں کوئی پرابلم بھی نہیں ہوتا ہوگا؟"

میں نے کہا: "ایک پرابلم ہے!"

"کیا — ؟"

"چین!"

چونک کر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے: "کیا وہاں بھی چین کا پرابلم ہے؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا: "سورگ میں جتنے چینی آباد ہیں سب ماؤ تسے تنگ کے چیلے ہو رہے ہیں۔ دن رات ماؤ تسے تنگ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورگ میں چونکہ چینیوں کی آبادی دوسری قوموں سے زیادہ ہے اس لئے سورگ پر چینی جھنڈا لہرایا جائے! بھگوان کے سامنے یہ بڑی سمسیا ہے کہ سورگ اور نرک دونوں پر چینی اپنا حق جتانے پر تل گئے ہیں!"

"پھر بھگوان نے کیا سوچا؟" پنڈت جی نے پوچھا۔

"بھگوان نے سوچا ہے کہ چند بڑے بڑے چینی نیتاؤں کو سورگ میں بلا کر ان سے بات چیت کی جائے!"

یہ سن کر پنڈت جی مسکرائے۔ انٹرویو ختم کر کے مجھ سے ہاتھ ملا کر بولے کہ "جانے سے پہلے ضرور ملئے گا!"

آپ کا داس

دیو رتن

نئی دہلی

۲۰ اگست ۱۹۶۳ء

اندر دیو جی مہاراج

شری گلزاری لال نندہ نے مجھے بتایا کہ ہندوستان میں کسی طرح کا دھرم سنکٹ نہیں ہے۔ ہندوستان میں پندرہ لاکھ سادھو رہتے ہیں۔ ان سادھوؤں

کی موجودگی میں کسی طرح کا دھرم سنکٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ مولوی لوگ ہیں۔ کرسچین پادری ہیں۔ بودھ بھکشو ہیں۔ جینی گرو ہیں۔ اور یہودی مہاتما ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد ہندوستان میں دنیا کے کسی بھی دوسرے دیش سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ سوچنا کہ ہندوستان میں دھرم اور مذہب خطرے میں ہے دراصل ہندوستان کی روحانیت پر بہتان لگانا ہے۔ میرے خیال میں سورگ میں کچھ کمیونسٹ لوگ پہنچ گئے ہوں گے اور انھوں نے یہ خبر اڑائی ہوگی"!

میں نے کہا: "سورگ میں کوئی کمیونسٹ داخل نہیں ہو سکتا۔ مہاراج اندر اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔"!

"ارے آپ نہیں جانتے"۔ گلزاری لال نندہ سر ہلا کر بولے "یہ لوگ بڑے چالاک ہیں ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں"!

گلزاری لال نندہ نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ اگر میں واقعی ہندوستانی روحانیت کی معراج دیکھنا چاہتا ہوں، تو مجھے ڈاکٹر رادھا کرشنن سے ملاقات کرنا چاہیئے۔ انھوں نے از راہِ کرم میرے لئے خود راشٹر پتی سے ٹیلیفون کر کے ان سے ملاقات کا وقت لے لیا۔ پرسوں ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ آج شام روسی سفیر میرا اکٹا دیکھنے کے لئے آ رہا ہے۔ رات کو امریکی سفیر ڈنر دے رہا ہے۔ پرسوں برٹش ہائی کمشنر نے لنچ پر بلایا ہے۔ بڑی مصروفیت رہے گی۔ اگر دو تین دن تک خط نہ لکھ سکوں تو شما کیجئے گا!"

آپ کا داس

دیو رتن

نئی دلی

۲۸ راگست ۶۳ء

یور ایکسیلینسی اندر راج جی مہاراج!

ہند سرکار نے ہندوستان کی دھارمک اوستھا پر غور کرنے کے لئے

ایک دھارمک کمیشن بٹھانے کا طے کیا ہے اور مجھے اس کا صدر چُنا ہے تنخواہ دو ہزار روپئے ماہوار سفر خرچ اور ہوٹل کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔ چھ مہینے سارے ہندوستان کا دورہ کروں گا۔ ایک لیڈی اسٹینو اور دو اردلی میری خدمت کے لئے مامور کئے گئے ہیں۔ سفر ہوائی جہاز سے ہوگا اور اگر کہیں پر ہوائی جہاز نہ ہوگا تو ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ سے ہوگا ہندوستان کے جن علاقوں میں پردہیشن ہے وہاں میرے لئے وہسکی کا خاص کوٹا منظور کیا گیا ہے کیونکہ وہسکی کی عجیب لت پڑ گئی ہے۔ پی کر بالکل سوم رس کے سے جھونکے آتے ہیں۔ (اور اسی لئے پیتا بھی ہوں کہ اپنے دیس سے اس قدر دور ہوں)

میں نے کمیشن کا صدر بننا منظور کر لیا ہے۔ نیز ہند سرکار نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ اگر مجھے اپنی تحقیقات کے سلسلے میں یورپ جانا پڑا تو اس کے لئے فارن ایکسچینج بھی منظور کر دیا جائے گا کیونکہ سری 108 سوامی اُدبُدآنند کے شبدوں میں "بھارت میں روٹی کا سنکٹ تو چلتا ہی رہتا ہے لیکن اگر بھگوان نہ کرے کہیں پر دھرم سنکٹ بھی بھارت میں شروع ہو گیا تو ہماری سنسکرتی کا دیوالہ پٹ جائے گا!"

بھارت کو اس دُرگھٹنا سے بچانے کے لئے میں نے اس کمیشن کا ادھیکش بننا سوئیکار کر لیا ہے۔ آشا ہے آپ آشیرواد دیں گے!

ہاں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ راشٹرپتی رادھا کرشنن سے ملاقات ہوئی تھی۔ بہت ہی پہنچے ہوئے اونچے درجے کے فلاسفر اور ودوان ہیں۔ میں ان سے ان کی کچھ کتابیں مانگ کر لایا ہوں، آج کل دن میں ان کا مطالعہ کرتا ہوں، رات کو نائٹ کلب میں جاتا ہوں، بڑی مصروف زندگی ہے نئی دلی کی — اگر اگلے دو تین ہفتوں تک میرا خط آپ کو نہ ملے تو پریشان نہ ہو جئے گا۔ میں برابر آپ کا کام کر رہا ہوں —

چرنوں کا داس

دیورتن

نئی دہلی

۲۸ نومبر ۶۳ء

اِندر مہاراج!

آپ کا خط مل گیا، جس میں آپنے مجھے ڈانٹنے کی کوشش کی ہے۔ آپکا خیال ہے کہ میں بھارت میں آکر اپنا فرض بھول گیا ہوں، دن رات حاکموں کے ساتھ لنچ اور ڈنر کھاتا ہوں ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں، اونچے ہوٹلوں میں ٹھہرتا ہوں اور سرکار سے ڈیلی بھتہ چارج کرتا ہوں۔ مگر وہ تو سب کرتے ہیں اس لئے اگر میں بھی کرتا ہوں تو کیا غلط کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں برھمانڈ کا سب سے بڑا راج دوت ہوں اس لئے مجھے اپنی پوزیشن کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ مجھے عام جنتا سے میل جول رکھنا چاہیئے۔ غریب لوگوں سے مل جل کر ان سے دریافت کرنا چاہیئے کہ ہندوستان کی دھارمک اوستھا کیسی ہے؟ میں آپکو بتانا چاہتا ہوں کہ گذشتہ تین ماہ سے میں یہی کر رہا ہوں۔ میں اپنی اسٹینو کو کیلا کو لیکر ہندوستان کے مختلف شہروں میں گھوم پھر کر مختلف گلی محلوں میں جاکر صورت حال کا معائنہ کرتا رہا ہوں اور بیچ بیچ میں کو کیلا کو شاپنگ بھی کراتا ہوں (مس کو کیلا بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس کے لپ اسٹک کا فیوورٹ کلر ہلکا گلابی ہے) تین مہینے پوچھ تاچھ کر کے میں نے رپورٹ بھی تیار کر لی ہے۔ مس کو کیلا آج کل انگریزی میں ٹائپ کر رہی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی راشٹر بھاشا گو ہندی ہے لیکن سب کام انگریزی میں ہوتا ہے! یہ رپورٹ ڈیڑھ ہفتے کے اندر تیار ہو جائے گی۔ تیار ہوتے ہی اس کی ایک کاپی میں آپ کو فوراً بھیج دوں گا اور اگلے خط میں اس کا خلاصہ بھی بیان کر دونگا۔ انتظار کیجئے۔ اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ مس کو کیلا کو گلیتھر کوئن کے ہاں سے ایک نئی ساڑھی خریدنا ہے۔ پھر مجھے بینک جانا ہے پھر ہوائی جہاز پکڑنا ہے کلکتے کیلئے جہاں کل سے ALL WORLD'S RELIGIOUS CONFERENCE ہو رہی ہے جسکا چیرمین مجھے چنا گیا ہے۔

آپ کا داس

دیو رتن

بمبئی

۷ دسمبر ۶۳ء

مائی ڈیر اندر

کل نارد جی سے ملاقات ہو گئی کچھ پریشان نظر آتے تھے۔ کچھ خوش بھی۔ پریشان اسلئے تھے کہ ہندوستان میں آکر یہاں کے نیتاؤں کو نیتی کے کچھ سبق دینے آئے تھے۔ یہاں آکر اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے نیتاؤں سے مل کر انھیں معلوم ہوا کہ راج نیتی کے بارے میں نارد جی کا علم بالکل آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے نیتی کے مسئلے میں یہاں کا معمولی سے معمولی نیتا بھی نارد جی کے کان کاٹ سکتا ہے۔ خوش اس لئے تھے کہ تین ماہ مدراس رہ کر شری راجگوپال آچاریہ کے چرنوں میں بیٹھ کر ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اب ان کا ارادہ سورگ میں جاکر اس نئے علم کو آزمانے کا ہے اور آپ کا سنگھاسن ڈولانے کا ہے۔ ہوشیار رہئیگا۔

میں اپنی مفصل رپورٹ نارد جی کے ڈپلومیٹک بیگ میں ڈال کر بھیج رہا ہوں خلاصہ اس خط میں بیان کرتا ہوں۔

۱ = ہندوستان کی دھارمک اوستھا بہت بگڑ گئی ہے۔ غریب لوگ بھگوان کو بھول گئے ہیں اور ہر وقت دال روٹی کے چکر میں گرفتار رہتے ہیں۔ مندروں میں آرتی اتارنے کے بجائے ہر وقت مہنگائی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ ایسے ناشکرے لوگ میں نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھے۔ میرے خیال میں تو ان کے ناشکرے پن کی سزا ملنی چاہئیے اور انھیں اور غریب بنا دینا چاہئیے۔ ہند سرکار میرے اس مشورے پر بڑی ہمدردی سے غور کر رہی ہے۔

۲ = بڑے بڑے مندروں میں سینما کی طرح درجے مقرر ہو گئے ہیں بھگوان کی مورتی کو سو گز کے فاصلے سے دیکھنے کی فیس صرف چار آنے ہے۔ پچاس گز سے دیکھنے کی فیس آٹھ آنے ہے۔ بیس گز سے دیکھنے کی فیس ایک روپیہ ہے۔ دس گز کے فاصلے پر استتی کرنے کی فیس صرف پانچ روپئے ہے۔ جو بھگت بھگوان کے چرنوں کو چھو کر پرارتھنا کرنا چاہتے ہیں وہ دس روپئے دے کر پرارتھنا کر سکتے ہیں۔ مگر غریب لوگ اپنے دھرم سے اس قدر منحرف ہو چکے ہیں کہ ڈیڑھ روپیہ خرچ کر کے سنیما چلے جائیں

گے مندر نہیں جائیں گے !۔

۳ = اچھے اچھے مندروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بہت سے مندروں میں ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں جہاں غالباً ڈائریکٹ ٹرنک کال پر بھگوان سے بات ہو سکتی ہے۔ یہ وہ تلسی داس کے زمانے کی بات نہیں رہی کہ ہر وقت مندر میں جا کر بھگوان کو پریشان کیا جائے۔ آج کل ہر مندر کے کواڑ ایک بجے سے لیکر تین بجے تک بند کر دیئے جاتے ہیں تاکہ بھگوان کو آرام کرنے کا موقع مل سکے۔ رات کو مندر کے کواڑوں پر تالہ لگا دیا جاتا ہے۔ تاکہ بھگوان آرام سے سو سکیں۔ پہلے زمانے کے بھارت میں بھگوان کو ایک لمحے کے لئے سونا نہیں ملتا تھا۔

۴ = آج کل دیا دھرم کا بھاؤ صرف پیسے والوں میں رہ گیا ہے جو آدمی چند لاکھ روپئے کما لیتا ہے فوراً ایک مندر بنانے کا آرڈر دے دیتا ہے اور چونکہ اس دیش میں پرمٹ اور کوٹے کا عام رواج ہے اس لئے مندر کے لئے سیمنٹ بھی بہت جلد مل جاتا ہے بلکہ مندر بناتے بناتے اتنا سیمنٹ بچ جاتا ہے کہ مندر بنانے والا اس سے اپنی بلڈنگ بھی بنا لیتا ہے۔ اس وجہ سے دھڑا دھڑ مندر بن رہے ہیں۔ مگر یہ سب اونچے درجے کے لوگوں کی نیک نیتی کی وجہ سے ہو رہا ہے ورنہ عام لوگوں کے دلوں سے دھرم اور ایمان کا جذبہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ابھی چند دن کی بات ہے۔ میری ملاقات ایک سیدھی عورت سے ہوئی جو اپنی فیملی کے ساتھ نیر دلی سے آئی ہے۔ جب میں اس کے دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں گھسا تو یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ ایک کونے کے طاقچے پر بھگوان کی مورتی بھی رکھی ہے، پوچھنے پر وہ بڑی بیزاری سے بولی۔ "آں، رکھ دیا ہے اس کو میں نے طاقچے پر! نیر دلی میں میرے پاس ایک بہت بڑا بنگلہ تھا۔ تو میں نے اس میں بھگوان کو بھی ایک کمرہ دے رکھا تھا۔ یہاں بمبئی میں صرف دو کمرے کا فلیٹ ہے اس لئے میں نے بھگوان کو ایک طاقچے میں رکھ دیا ہے، اب میں کیا کروں ؟ جیسی جگہ وہ مجھے دے گا ویسی جگہ خود اس کو ملے گی، میں نے بھگوان کو یہ بات بول دیا ہے !"

۵ = آج کل سب چیزوں کی طرح بھارت میں دھرم بھی بکتا ہے

مگر اس کا بھاؤ کچھ زیادہ نہیں ہے، بازار میں ایک ایک ٹماٹر بیچنے جاؤ تو چھ آنے مل جائیں گے، ستیہ نارائن کی کتھا بیچنے جاؤ تو کوئی تین آنے نہیں دے گا۔ اس دن ایک چھوٹے سے مندر میں میں نے ستیہ نارائن کی کتھا رکھی چڑھاوے میں صرف ڈھائی آنے وصول ہوئے بے چارہ پجاری رونے لگا بولا "میں تو اب مندر بند کرکے شراب کی سمگلنگ شروع کرتا ہوں۔ ورنہ زندہ کیسے رہوں گا!"

۶: دھرم کے دام اچھے نہیں ملتے مگر دھرم کے نام پر دھوکے دھڑی کے دام اچھے مل جاتے ہیں۔ تین مہینے پہلے کی بات ہے دلی کے نزدیک غازی آباد کے مقام پر چند نام نہاد شردھالو بھگتوں نے ایک بڑھیا کے سترہ سالہ نیم پاگل لڑکے کو یوگی مشہور کر دیا اور اسے چالیس دن کے لئے ایک سمادھی میں گاڑ دیا۔ اوپر سے مٹی ڈالکر سمادھی کا منہ اچھی طرح سے بند کر دیا تاکہ ہوا کسی طرح سے جانہ پہنچنے پائے اور مشہور کر دیا کہ چالیس دنوں کے بعد یہ لڑکا زندہ اور صحیح وسلامت سمادھی سے برآمد ہوگا۔

بس پھر کیا تھا ہر روز اس سمادھی کے درشنوں کے لئے مخلوق آنے لگی اور بے تحاشہ چڑھاوا چڑھنے لگا۔ پہلے دن اسّی روپے کا چڑھاوا چڑھا دوسرے دن سو روپئے کا۔ پانچویں دن ڈیڑھ سو روپئے کا پھر ڈھائی تین سو روپئے کا چڑھاوا ہر روز چڑھنے لگا۔

چالیسویں دن جب سمادھی کو کھولا گیا تو اس میں سے بے چارے لڑکے کی لاش گلی سڑی ملی۔ لوگوں نے جب پجاریوں کو ڈھونڈھا تو وہ چڑھاوے کی رقم لے کر مفرور ہو چکے تھے اس لڑکے کی بڑھیا ماں زار وقطار روتی تھی پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ اس کا اپنا لڑکا نہ تھا۔ اس نے کسی سے مانگ کر اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور اب وہ اس لئے نہیں روتی تھی کہ اس کا لڑکا مر گیا تھا بلکہ اس لئے کہ فرار ہونے والے بھگتوں نے بڑھیا کو چڑھاوے کی رقم سے اس کا حصہ نہیں دیا تھا! یہ واقعہ بالکل سچّا ہے اور اخباروں میں آچکا ہے!

مفصل رپورٹ نارد جی کے ہمراہ روانہ کر رہا ہوں۔ پڑھ کر اپنی رائے

سے مطلع کیجئے گا۔ میں کل کمیشن کے کام سے کشمیر جارہا ہوں کیونکہ یہاں گرمی بہت بڑھ گئی ہے اور کام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہو سکتا نیز کو کیلا نے آج تک کشمیر دیکھا بھی نہیں اسی بہانے بے چاری کشمیر دیکھ لیگی! (کو کیلا بہت پیاری لڑکی ہے۔ ایسا عمدہ TWIST ناچتی ہے کہ آپ دیکھ لیں تو مینکا کا ناچ بھول جائیں!

آپ کا داس

دیو رتن

سورگ سے دیوراج مہاراج اندر کا ٹیلی گرام دیورتن کے نام :—

"فوراً سورگ میں واپس چلے آؤ"

اندر راج

جوابی ٹیلی گرام دیورتن کا اندر کے نام :—

"نہیں آسکتا۔ کیونکہ کو کیلا سورگ میں جانے کے لئے راضی نہیں ہے" لہٰذا مجبور ہوں۔

دیو رتن

ارجنٹ ٹیلی گرام :—

"فوراً واپسی کی اطلاع دو۔ ورنہ سورگ سے باہر نکال دیئے جاؤ گے؟"

اندر

دیورتن کا آخری ٹیلی گرام اندر کے نام :—

"یہ دنیا اپنی تمام خامیوں کے باوجود بے حد خوبصورت ہے۔ اس لئے نہیں آسکتا —!!"

"شکار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر"

شاہکار کی فخریہ پیش کش

"فراق نمبر"

جلد ہی منظر عام پہ آرہا ہے

شاہکار، ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد ۲

مردہ پرستی کے اس دور میں زندہ دوستی کی عظیم روایت کا علمبردار

افکار

جوش نمبر اور حفیظ نمبر جیسی بے مثال اور لازوال اشاعتوں کے بعد

ہندو پاک کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے تعاون سے

۱۹۶۴ء کے آخر تک

فیض نمبر

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

نئے سالانہ ممبر بارہ روپے بھیجکر فیض نمبر رعائتی قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں۔

مکتبۂ افکار رابسن روڈ کراچی

اُردو کے مایہ ناز شاعر عبد العزیز خالد کے

شعری مجموعے

سرودِ رفتہ	یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کے نغمے	چار روپے
غزل الغزلات	عہد نامہ عتیق کا نغمۂ سلیمان مع اشارات	ایک روپیہ پچھتر پیسے
دکانِ شیشہ گر	منظوم ڈرامے	تین روپے
برگِ خزاں	"	چار روپے
ورقِ ناخواندہ	"	تین روپے
سلومی	دوسرا ایڈیشن مع اضافہ ترگوم	تین روپیہ پچاس پیسے
گلِ نغمہ	ٹیگور کی گیتانجلی، اُردو شعر میں	چار روپے
زنجیرِ رمِ آہو	طویل و مختصر نظمیں	دو روپے
کلکِ موج	افکارِ تازہ غزلیں نظمیں	سات روپیہ پچاس پیسے
ماتمِ یک شہرِ آرزو	رلکے کے ڈیونو نوحے (نیا ایڈیشن)	زیرِ طبع
زرداغِ دل	طویل نظمیں (نیا ایڈیشن)	"
دشتِ شام	مختصر نظمیں	"
کفِ دریا	انتخابِ کلام	"

دوآبہ کوآپریٹو پبلشرز لمیٹڈ

۹۳۔ نیو کلاتھ مارکیٹ۔ کراچی ۲

راجندر سنگھ بیدی

یوکلپٹس

بہت ہی مرامرا سا دن تھا جبکہ نومبر کی وہ ٹھٹھری ہوئی رات پیدا ہو رہی تھی لمبے دھڑا دھڑ ایک دوسرے پر ڈھیر ہو رہے تھے اور مٹی کا وہ ٹیلہ بن رہے تھے جس میں سے یوکلپٹس کا پیڑ پھوٹ کر نکلتا ہے۔

کندن ایک اعصاب زدہ ٹیلیفون کے جواب میں گھر لوٹی تھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے سائیکل کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دوسرے سے کتابیں جو خام چمڑے کے فیتے میں کیریر پر ڈھیلی ہو رہی تھیں یہ کتابیں کندن نے اسی شام فادر ولیم اسکول کی لائبریری سے نکلوائی تھیں، جہاں وہ وائس پرنسپل تھی۔ قاعدے سے کندن کو کوبی کی طرح سے بنگلے میں داخل ہونا چاہیئے تھا مگر پھاٹک کے اندر آتے ہی وہ ہمیشہ کی طرح سُر جُب کے پاس رک گئی۔

—— سُر جُو یوکلپٹس کے پیڑ کا نام تھا۔

یہ پیڑ کندن نے تین سوا تین برس پہلے لگایا تھا جبکہ وہ نئی نئی پیرس لوسن یونیورسٹی سے ٹیچنگ کا ڈپلوما کر کے آئی تھی۔ جب یہاں کیتھولک چیپلن فادر فشر رہا کرتا تھا جس نے بنگلے کا آدھا حصہ کما ہی کندن کو دے رکھا تھا۔ پھر برس ایک کے بعد وہ مشن کا کام پورا کر کے امریکہ چلا گیا اور کندن نے تنہائی سے گھبرا کر اپنی بوڑھی ماں کو بلا لیا۔ سائیکل کو جنگلے کے سہارے رکھ کر کندن سُر

کے پاس آئی اور اوپر کی طرف دیکھنے لگی جہاں پتے اب تک اندھیرے کا رنگ لے چکے تھے البتہ نیچے کی سفید ملائم اور بھیچی چھال ابھی تک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پیار سے اس پہ ہاتھ پھیرنے ہی والی تھی کہ ایک طرف، برآمدے میں، اسے اپنی جیلی فش ماں کا ہیولا سا نظر آیا۔ اسی وقت جھک کر کندن نے پیڑ کے نیچے سے تازہ گرے ہوئے پتے اٹھا لئے اور ہاتھ میں مسل کر انھیں سونگھنے اور لانبے لانبے سانس لینے لگی جیسے اسے زکام ہو اور یوکلپٹس کی بو تنفس اور اسکی رگوں وریشوں کو ایک طرح کا سکون دے رہی ہو۔ پھر ماں کی طرف منہ کرتے ہوئے کندن تھوڑا کھسیائی "میں تو سُرجو کو بڑھتے دیکھ بھی سکتی ہوں" ماں"۔ اور اس نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

ماں کے چہرے میں سے پسینے کے باریک قطرے برس رہے تھے جیسے کورے گھڑے میں پانی ڈالنے سے وہ رسنے لگتا ہے۔ دوپٹے سے ماں اپنے چہرہ پونچھتے ہوئے بولی "یہ دن کو نہیں رات کو بڑھتے ہیں کندن"

"کیوں۔ رات کو کیوں؟"

"اُپتی کے سب کام پرماتما اندھیرے میں کرتے ہیں"

اور پھر ماں چپ ہو گئی۔ کندن کو ماں سے کسی اور بات کی توقع بھی نہ تھی۔ وہ جانتی تھی ماں ایک پیڑ کے ساتھ اپنی بیٹی کی بیاری محبت کو دیکھ کر اکثر پریشان ہو اٹھتی ہے۔ سائیکل کو جنگلے پر سے اٹھا کر کندن برآمدے کے پاس پہنچی ہی تھی کہ ماں نے کہنا شروع کیا "پھر کیا نا وہی کلجگن، لکھی نے..."

لکھی کندن کی کرشچن نوکرانی تھی۔ کندن نے وہیں رکتے ہوئے کہا "کیا مطلب" اور پھر، جیسے اپنے آپ سمجھ گئی ...... "شروع ہو گیا؟"

"ہاں"

"کب؟"

"جب پڑوس کے مالی سے تمہیں مالی فون کرایا تھا"

اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ماں نیچے فرش ہی پہ بیٹھ گئی حالانکہ پاس ہی برآمدے میں ملاقاتیوں کے لئے رکھی ہوئی آدھی درجن بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔ یہ حرکت عورتیں اس وقت کرتی ہیں جب کوئی مرنے والا ہو، یا مر چکا ہو۔

ادھر لکھی اپنے کوارٹر میں کراہ رہی تھی۔ ادھر ماں گالیاں بکے جا رہی تھی۔ اس کی آخری گالی تھی "چھنار......" جبھی لکھی کی چیخ سنائی دی تو ماں اور کندن دونوں منہ اٹھا کر اندھیرے

میں دیکھنے لگیں جیسے لکھی سامنے تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہو...... شاید..... زہ کے درد میں مبتلا عورت کہہ رہی ہو۔ دوسری سب عورتوں کو دکھائی دینے لگتی ہے۔

کندن نے ایک دم گھبرا کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماں"

"سن رہی ہوں" ماں نے اپنے بوڑھے، چرخ چوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر مشکل سے اٹھتے ہوئے کہا اور گرتے گرتے بچی — "مجھے بھی کان دیئے ہیں پر ماتما نے" وہ بولی — اور سچ مچ ہی اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے دونوں ہاتھ کانوں کی طرف اٹھا دیئے۔

کیا جذبہ تھا کہ دوسری چیخ کے ساتھ ہی ماں بھی چلا اٹھی "مرتی ہے تو مر جائے.... کیوں نہیں دن کے وقت بتاتی رانڈ؟...... پارسال بھی ایسے ہی کیا تھا....."

ماں بولے بغیر بھی نہ رہ سکتی تھی — "کیسے خونو خون" ہو گئے تھے میرے ہاتھ پیر اور کپڑے جو نوچندی میں بنوائے تھے۔ تم نے پیسے بھیجے تھے..... میں اس کے باپ کی دائی ہوں؟" پھر ماں کے پیر کوارٹر کی طرف اٹھ گئے، پھر وہ لوٹ بھی آئے۔

چیخ جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سنائی دے رہی تھی، مسلسل ہو گئی۔ کندن کے پیٹ میں بھی جیسے کوئی آزار پیدا ہو گیا اور طنابیں سی نیچے کھنچنے لگیں۔ سامنے ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بولی۔ "تو سمجھتی کیوں نہیں ماں؟ — وہ غریب ہے، پیسے والے سو وار و کر سکتے ہیں۔"

اور کندن آپ ہی کوارٹر کی طرف چلی اور ماں نے لپک کر اسے بازو سے تھام لیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولی — "کندنا"! اور پھر کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے کہنے لگی "یہ کام تیرے ایسی کچی کنواری کا ہے؟"

ماں لکھی کے پاس جانا بھی چاہتی تھی اور اپنی اہمیت کو جتانا بھی۔ جاتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بکے جا رہی تھی۔ صرف ایک ہی لفظ کندن کے کان میں پڑا — "چھنار"

کہیں سے کوئی چمگادڑ آڑا اور ڈرائنگ روم کے اندر پیرا بولائی شکلیں پیدا کرتا ہوا سامنے پہاڑیوں کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے باہر اڑ گیا جس میں ایک روز پہلے کی بارش کی وجہ سے بھینٹا قطار در قطار اندر آ رہے تھے اور سو واٹ کے بجلی کے ہنڈے سے ٹکرا کر زمین پر ڈھیر ہو رہے تھے

جب وہ گرتے تو پتہ بھی نہ ہلتا۔ صرف نیچے دیکھنے سے یوں لگتا جیسے زمین اوپر کی طرف اٹھ رہی ہو۔۔۔ اور لمحوں کا ایک ٹیلہ بن رہا ہو۔۔۔۔ کندن کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور انتظار کرنے لگی۔ روشنی میں تو اونچے نیچے سب نظر آتا ہے مگر اندھیرا ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا کرتا ہے۔ صرف اس کے عادی ہو جانے پر مصیبتوں کے ہلکے خاکے اور گہرے خاکے دکھائی دیتے ہیں جو اس یکسانیت میں اور بھی تائید کا عالم پیدا کر دیتے ہیں اور آدمی گھبرا کر کھڑکی چھوڑ دیتا ہے۔ اور ایک بے پناہ حبس سے بچنے کے لئے کسی کا بھی گریبان پھاڑ دیتا ہے۔

کندن واپس آکر صوفے میں بیٹھی تو یوں معلوم ہوا جیسے صوفے کے بازو اوپر اٹھے اور ایک حسین لڑکی کو آغوش میں لے لیا۔۔۔ کندن انتظار کرنے لگی۔

پہلے تو انتظار ٹک ٹک کرتا رہا پھر وہاں کے کیتھولک مشن کے گرجے میں لگے ہوئے گھڑیال کی طرح بجنے لگا۔ چیخیں تھم چکی تھیں۔ شاید ماں کے پہنچ جانے سے لکھمی کو حوصلہ ہو گیا تھا شاید بچہ پیدا ہو گیا تھا۔۔۔ نہیں، بچہ اس دنیا میں آتا تو ضرور روتا۔۔۔۔۔

شاید ماں کو گرم پانی کی ضرورت پڑے۔۔۔۔۔ کندن لکھمی کی کھولی تک جا پہنچی لیکن سوائے ماں کے بڑبڑانے کے اور کوئی آواز نہ سنائی دی۔ وہ ضرور گالیاں تھیں جنھوں نے اس سانحے کے پیش نظر بہ شکل سکوت اختیار کر لیا تھا۔۔۔۔۔ بیچ میں کندن کو کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی لکڑی کو چیرنے کے بجائے زمین پر مار مار کر توڑ رہا ہو۔ پھر لکھمی کے ہونکنے کی آواز جیسے اس نے افیون کھائی ہو اور اصل کی تائید اور نقل کی تردید کرنے کا جتن کر رہی ہو۔ کندن کے اپنے بدن میں سے کوئی بجلی جھٹکی اور بنگلے کی طرف مڑ آئی۔ راستے میں سُرخو کی طرف دیکھا تو اسے ایک بچہ دکھائی دیا جس سے ڈر کر وہ بھاگتی ہوئی ڈرائینگ روم میں داخل ہو گئی۔

تھوڑے سے حواس بجا ہوئے تو کندن تپائی پر پڑی ہوئی کتابیں الٹنے پلٹنے لگی ان پہ کھڑکی میں سے آنے والے بے شمار لمحے بکھرے پڑے تھے جن کے پر جھلسے ہوئے تھے اور بدن مردہ۔ کندن نے اوپر کی کتاب کو صاف کیا جس کا عنوان تھا۔ "مرد عورتوں کے بغیر۔۔۔۔" اس نے کتاب کھولی پہلی چند سطریں پڑھیں اور پھر بند کرتے ہوئے سوچنے لگی — "عورتیں مردوں کے بغیر"

فادر ولیم اسکول کی وائس پرنسپل کماری کندن ایم۔ اے ٹی ڈپ کے بنگلے میں تین عورتیں تھیں اور تینوں مردوں کے بغیر — پہلی ماں — سبھاشنی جو اب چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی اور بے شمار لمحے اس پر ڈھیر ہو کر تہیں جما چکے تھے۔ اس کا نام آج کل کی لڑکیوں کا سا تھا۔ لیکن اب تک

اس نام کی سب لڑکیاں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ نئے نام پرانے ہو چکے تھے اور نئی طرز کے وضع نہ ہوتے تھے اور لوگ مجبور ہو کر پرانے ناموں پر لوٹ آتے تھے جیسے — کندن.... جو نام تو بوڑھا تھا مگر اب جوان ہو چکا تھا پچیس چھبیس برس کا — اور خوبصورت اور دمکتا ہوا — سبھاشنی بدصورت تھی اور کندن یتیم۔ اس نے تو باپ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی اور زندگی بھر اس کے لئے تڑپتی رہی تھی — ابھی وہ پیٹ ہی میں تھی کہ ماں کے بیان کے مطابق کندن کا باپ چل بسا تھا اس صدی کے شروع میں جو پلیگ پڑی تھی اس نے موت میں، سچ اور جھوٹ کو برابر کر دیا تھا۔ عجیب سی یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ اس لئے جب مشن میں فادر مائیکل آسمانی باپ کے بارے میں باتیں کرتا تو کندن ہمیشہ سوچنے لگتی — وہ تو مر چکا ہے کسی زمینی پلیگ میں اور جب اسے کہا جاتا آسمانی باپ لافانی ہے وہ کسی پلیگ میں نہیں مر سکتا تو وہ اسے ڈھونڈنے کے سلسلے میں قریب کے کسی بھی مرد پر عاشق ہو جاتی چاہے وہ کیتھولک چیپلن ہی کیوں نہ ہو حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کیتھولک پجاری کبھی شادی نہیں کر سکتے —

کئی بار کندن نے چچا، تاؤ اور ددھیال کے بارے میں پوچھا لیکن ماں نے ہمیشہ دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا — سب کھپ گئے دوسرے پلیگ میں...... تیسری پلیگ کب آنے والی تھی اور پھر ایکا ایکی متجسس سی نگاہیں کندن پہ پھینکتی ہوئی ماں پوچھنے لگتی — "تو کیوں پوچھتی ہے"

"ایسے ہی" کندن جواب دیتی اور پھر کہہ اٹھتی "ماں! آج ٹیچر نے مجھے یہ ریشمی رومال دیا تھا مجھ سے بہت پیار کرتا ہے"

سبھاشنی نے اپنا رنڈاپا اپنے چچیرے بھائی ہولک رام کے ہاں کاٹ دیا تھا جو امرتسر میں لاہور اور تبت سے آئے ہوئے کٹھ کا بیوپار کرتا تھا کٹھ جو مرتے ہوئے آدمی میں بھی ایک بار تو زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے وہ مرتا ضرور ہے لیکن اس سے پہلے وصیت کر جاتا ہے سبھاشنی نے کندن کے ساتھ ساتھ اپنی بھتیجیاں اور بھتیجے کھلائے تھے اور اس کے عوض روٹی کے روکھے سوکھے ٹکڑے پائے تھے اسی لئے کندن کے لئے اس کی لوریاں بھجن ہو گئی تھیں — روکھا سوکھا روٹی کا ٹکڑا میٹھا کیا اور سلونا کیا..... وہ بھابھی کے پھٹے پرانے پہنتی تھی تو اکثر باہر نہ نکل سکتی تھی کیونکہ اس کا جسم جوں کا توں بھرا ہوا تھا حالانکہ بھابھی کا خرچ کی وجہ سے چاند کی طرح گھٹتا جا رہا تھا۔ بھابھی کے کپڑوں میں سبھاشنی برہنہ معلوم ہوتی تھی وہ ہمیشہ ایک جرم کے احساس اور اذیت پسندی کے جذبے میں نیچے ٹھنڈے فرش پہ سوتی تھی اور ایک رہبانیت سی اس کے جذبات پہ چھائی رہتی تھی۔ جس کی اداسی بھری ایک تسلی تھی۔ اسے اس حدت کا احساس ہی نہ تھا جو مرد کے ساتھ چارپائی پہ سونے سے

عورت کے بدن میں اپنے آپ پیدا ہوتی رہتی ہے پھر سونے میں کبھی تکیہ اور لحاف وغیرہ ہوتے تھے اور کبھی نہ ہوتے تھے سوائے سردی کے موسم میں انکی ضرورت بھی کیا تھی — پھر، سبھاشنی سوتی ہی کہاں تھی ؟ جاگتی بھی کہاں تھی ؟ وہ تو خواب اور بیداری کے اعراف میں روتی ہنستی رہتی اور بھجن اسکا سہارا ہوتے۔

جب نینن سے نیند گنوائی تکیہ اور بچھونا کیا

آخر سمجھ بوجھ کچھ سوچ پیارے، پیار کیا تو رونا کیا؟

بھابھی کی گالیوں کو سبھاشنی نے گھی کی مالیس سمجھا اور مار پیٹ، دھکوں کو پھولوں کی چھڑیاں، اور یوں کندن کو پڑھایا۔ باقی وہ وظیفوں اور سرکاری گرانٹوں سے آگے بڑھتی بڑھتی امریکا جا پہنچی، وہ خوبصورت تو تھی ہی اس پر تعلیم نے اسکے حسن کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں پیسوں شک تھے اور وسوسے۔ ایک عجیب سے ارتقا میں اس کی آنکھیں کانوں تک کھنچ آئی تھیں معلوم ہوتا تھا سامنے جاتی ہے تو پیچھے بھی دکھائی دیتا ہوگا۔ یا وہ ایسے ہی دیکھتے رہتی تھی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو — باپ نہ ہونے سے لڑکیوں کو کیسی کیسی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔..... اس کے باوجود بارہ تیرہ برس ہی کی عمر میں کندن کو ایک ایسے مرد کے سلسلے میں تجربہ ہوا تھا کہ وہ جس کے بارے میں وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ شاید وہ مر جاتی مگر کٹھ نے اس کی زندگی بچالی تاکہ وہ بڑی ہو کر یوکلپٹس کا پیڑ ہو سکے۔ یہ سب ایک طرح سے اچھا ہوا ورنہ کندن پڑھائی ہی کو شادی نہ سمجھتی —

تیسری عورت لکھتی تھی وہ تیس ایک برس کی تھی اور منفی ہونے کی وجہ سے تندرست، اس کا اصلی نام لکھشمی رام داس تھا اور اس کے شوہر کا نام سدھو یگر کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس کا نام کچھ چڑھا کہ پھر نہ ہٹا اور لکھتی آج تک نہ بتا سکتی تھی کہ رام داس اسکے باپ کا نام تھا یا کسی پہلے شوہر کا — کبھی وہ شوہر کا نام بتاتی اور کبھی باپ کا اور پھر ایک ابتری کے عالم میں "میرے باپ کا بھی وہ نام تھا جو میرے مرد کا —"

لکھتی کا یہ تیسرا مرد — سدھو وہاں سے اکاون باون میل دور کسی کلائری میں کام کرتا تھا وہ سال میں صرف ایک دو بار آتا جب اسکے کپڑے کوئلے اور اس کی دھول سے لٹے ہوئے اور چہرے پر سیاہیاں کینڈی ہوتیں۔ کچھ تو میلے کی اور کچھ ایسے جراثیم کی جن کا وہ بے اختیار مرتکب ہوتا۔ ان باتوں کے کارن وہ آپ ہی اپنا ہمزاد معلوم ہوتا تھا۔ وہ آتا تو نہایت بدصورت معلوم ہوتا اور جب نہ آتا تو اس سے بھی زیادہ بدصورت.......

سدھو کا بھوت بنگلے میں دکھائی پڑتے ہی ماں سبھاشنی اور بیٹی کندن پنجے جھاڑ کر لکھی کے پیچھے پڑ جاتیں —

"کیوں تو ہر بار اس کے ساتھ راس رچا بیٹھتی ہے؟"

"— جب وہ ذمہ داری لیتا ہے، نہ تیرے بچوں کی اپنے: . . . . ؟"

"سب مرد ایک ہی رسی سے پھانسی دیئے جانے کے قابل ہیں"

مرد . . . . لکھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگتی کبھی سب غلط اور کبھی سب سچ معلوم ہونے لگتا . . . . ہاں، ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے سب مرد اسی قابل ہیں کہ . . . . میں ایک اور کر لوں گی، مگر نہیں . . . . وہ بھی تو — پھر وہ غصے میں بھر جاتی اور اپنا ہاتھ جوتی کی طرف لے جاتی۔ اس کے بعد سدھو کا ہمزاد اسکی طرف آتا، نم آنکھیں، ہاتھ جوڑے اور لکھی کا ہاتھ جوتی کی طرف جانے لگتا پھر وہ دیکھتی جب تک سدھو کا ہاتھ لکھی کے بدن پر پڑتا اور لکھی کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی، آنکھیں چڑھنے بند ہونے لگتیں اور وہ بے دم سی ہو کر گر جاتی — اسے جبھی پتہ چلتا جب اسکے پیٹ میں کیڑا رینگنے لگتا —

کرشچین ہونے کے ناطے لکھی میں صبر تھا اور شکر بھی لیکن کندن نہ کرشچین تھی نہ مسلمان اور نہ ہندو وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی تھی جو سوچتی — کیا بکواس ہے؟ بچہ ہمیشہ عورت کو اٹھانا پڑتا ہے ایک دن تو آئے گا جب چاند زحل اور مشتری تک پہنچنے والے عورت کی سوچ بچار سے افلاک پر پہنچیں گے اور مرد کے ہاں بھی بچہ ہونے کا سامان کریں گے۔ آخر سلسلہ تقلیب ہی کا ہے نا . . . . مگر ایسے میں داڑھی اگ آئے گی . . . .

ماں گرتی پڑتی چلی آئی — اس کے کالے بھورے بال بھیگے ہونے پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ منہ پر، کچھ جھکے جھکے شانوں پہ۔ اس نے کس قدر جلدی میں اپنے ہاتھ پیر خون سے صاف کئے تھے اس پہ بھی بانات کی قمیض پر ایک چھچھڑا لگا ہوا تھا جس کے بارے میں وہ نہ جانتی تھی وہ گالیاں دے رہی تھی تیز تیز اور بے ربط اس کی آخری گالی تھی . . . . "ایک اور لڑکی چلی آئی"

کندن چونک کر اٹھی، بچہ پیدا کر دینے کے بعد سنبھالنے کا کام کندن کا تھا جب وہ لکھی کے کوارٹر کی طرف لپکی تو ماں کہہ رہی تھی — "ایک لائسن (لائسنس) لے لو کندنا . . . ابکی وہ حرامی آیا تو میں اُسے گولی مار دوں گی"

اور ماں سبھاشنی اپنے تخئیل میں لاش دیکھ رہی تھی اور رو بھی رہی تھی جیسے ہر عورت اپنے بیٹے کی سرزنش کے بعد رونے بیٹھ جاتی ہے۔

سرجُو لہراتا رہا، ہر صبح و شام اسکول جانے سے پہلے اور لوٹنے کے بعد کندن اس کے پاس رکتی اور اسکی نرم سی چھال پر ہاتھ پھیرتی، پیار کرتی رہی۔۔۔۔۔ اور ماں سبھاشنی دیکھتی، پکارتی رہی — "کندنا! اب آبھی جا۔"

سرجو اب بیس پچیس فٹ لمبا ہو گیا تھا۔ کہیں سولہ سترہ فٹ اوپر جا کر تو اس کے تنے پھوٹے تھے اور پتے پھلیوں کی طرح عموماً لٹکتے رہتے جس کے کارن دوپہر کے سمے جب سائے کی ضرورت ہوتی تو سرجو بیکار ثابت ہوتا۔ البتہ پہلے اور پچھلے پہر جب چھاؤں یوں ہی بدن میں کپکپی پیدا کرتی تب یہ بھی لانبے اور گھنیرے سائے پیدا کرنے لگتا اور لکھی کی تینوں، چاروں بیٹیاں ریل ریل کھیلتی ہوئی ایک دوسرے کا فراک تھامے، نیچے سے ننگی، پیڑ کے نیچے چلی آتیں۔ اسکی آخری بیٹی، ریوڑی بھی — اپنا گول مٹول اور تپی دار چہرہ لئے، پیڑ کے نیچے سے ریت کے لمحے اکھٹے کرنے لگتی —

کندن نے ماں کے کہنے پر بندوق کا لائسنس تو نہ لیا تھا البتہ ایک اور بندوبست کیا تھا جو بندوق سے بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے بندوق تو رات کے وقت بیکار بھی ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ ہتھیار کبھی خالی نہیں جاتا اس لئے چاکلیٹ کے رنگ کا ایک کتا رکھ لیا تھا جس کا منہ خونناک تھا اور جبڑے کالے جن میں سے ایک فٹ کی زبان ہمیشہ باہر لٹکتی رہتی تھی جیگوار بہت موڈی کتا تھا۔ سدھو کو بنگلے میں آنے دینا تو کجا، کندن کو بھی اندر آنے کے لئے اس سے اجازت لینی پڑتی تھی۔

بچیوں سے جیگوار البتہ مانوس ہو چکا تھا کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے بنگلے میں رہتی تھیں۔

ایک دن لکھی کو ابکائیاں آنے لگیں اور بہت ادھر ادھر کی کرنے کے باوجود ماں کو پتہ چل گیا اس کے پیٹ میں بچہ ہے وہ کیسے ہوا؟ لکھی اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکتی تھی۔ اس نے بڑی سی بڑی قسمیں کھائیں کہ وہ اپنے مرد کے پاس نہیں گئی ماں سبھاشنی اور کندن جانتی تھیں کہ ریوڑی کے بعد سدھو بنگلے میں نہیں آیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ لکھی نے چوری چھپے کوئی اور مرد کر لیا ہو مگر لکھی انکار کرتی تھی وہ یہ بات بھی "سچ" کہتی تھی کہ اس نے کسی مرد کا

منہ بھی نہیں دیکھا۔ نہیں دیکھا تو پھر یہ سب کیسے ہوا؟۔
جنگلے میں کہرام مچ گیا۔ لکھی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی اور ماں بیٹی آپس میں لڑنے لگیں۔ ماں اس "کتیا" کو باہر پھینکوا دینا چاہتی تھی مگر کندن اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی ۔۔ اتنے ڈھیر سارے بچے لے کر وہ کہاں جائے؟ ماں نے خود اپنے بھائی اھولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی۔ کندن نے بہت سمجھایا بجھایا، پیروں پڑی لیکن جب ماں پاپ کی ہمسائی ہونے کو تیار نہ ہوئی تو کندن نے صاف کہہ دیا۔ "اچھا ماں تم جاؤ تو جاؤ میں لکھی کو نہ نکالوں گی" اس پر ماں خوب دھاڑیں مار کر رونے لگی یہ بیٹی میری .... ماں کا جانا سہ سکتی ہے لیکن لکھی کا نہیں۔ لکھی اسکی کیا ہوتی ہے؟ جبھی ماں کو بھابھی کے غصے یاد آئے اور اس نے بیٹی کے پیروں پہ سر رکھ دیا اور سفید بالوں کا واسطہ دے کر معافی مانگ لی ۔۔

لیکن پھر لکھی سے وہی پوچھ گچھ شروع ۔۔ "سچ بتا کہاں سے لائی ہے؟"

"کہیں سے نہیں"، لکھی کہتی "اگر میں نے پاپ کیا ہو تو خداوند یسوع میری چار دل بیٹیوں کو لے جائیں"

"بیٹیوں کا کیا ہے؟" ماں کہتی "وہ تو ہر عورت چاہتی ہے ۔۔"

کندن ایک جھٹکے کے ساتھ بات کاٹ دیتی "ماں"

ماں کندن کی طرف دیکھتی۔

"میں بھی تیری بیٹی ہوں" کندن آنکھوں میں شکایتیں، حکایتیں لئے ہوئے ماں سے کہتی۔

"تو چاہتی ہے پرماتما مجھے لے جائیں"

ماں سہما شنی کندن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تاکہ وہ اس سے زیادہ اشبھ اور اوگت والی بات نہ کہہ سکے اور پھر اپنی بیٹی سے لپٹ جاتی۔ کہتی ہوں "کندنی" ۔۔ اور پھر ۔۔ "تو میری بات نہیں سمجھتی میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں میں بھی سوچتی ہوں میں کیوں اس سنسار میں چلی آئی۔ کیوں نہ پیدا ہوتے ہی مر گئی!"

اس بات کے مہینے ڈیڑھ کے بعد ٹبح کاذب کے قریب جیگو ارابہت غرایا، بہت بھونکا، لیکن وہ لوہے کی موٹی سی زنجیر سے بندھا ہوا تھا برآمدے کے جس ستون کے ساتھ اسے باندھا گیا تھا اپنی جگہ سے ہل گیا مگر زنجیر نہ ٹوٹی اس کے یوں بے تحاشہ بھونکنے سے ماں اور کندن نے لیمپ ہاتھ میں لے کر ایک دو بار باہر جھانکا بھی مگر کچھ نہ دکھائی دینے پر خاموش ہو گئیں صرف

ماں نے کہا "جنگار کو کیا ہوا، آج"

"جانے... بہت ہی بھونکا ہے"

ادھر ہی بھونکتا ہے جس طرف سرجو ہے"

کندن نے ایک بار ادھر دیکھ لیا حالانکہ اندھی سی روشنی میں سرجو کی چھال بھی سیاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کندن بولی "ہاں ماں! جانوروں کو وہ بھی سب دکھائی دیتا ہے جو ہم انسان نہیں دیکھ سکتے۔

اور کندن نے پٹے سے گھسیٹتے ہوئے جگوار کو اندر ڈرائینگ روم میں باندھ کر دروازہ بند کر دیا ہاں اب سدھو آبھی جاتا تو کیا بگڑتا ہے؟

لیکن پو پھٹتے جب منہ میں برش لئے، کاندھے پر تولیہ رکھے، نائٹ گون میں ملبوس کندن باتھ روم سے بغلی کمرے میں داخل ہونے لگی تو اسے اپنی نگاہوں کے سامنے یوکلپٹس کے پیچھے کوئی سفید چیز دکھائی دی۔ وہ پہلے ٹھٹھکی اور پھر سنبھلتی ہوئی ایک طرف بڑھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بیٹھا ہوا ہے اور دعا پڑھ رہا ہے، جبھی ایک سفید فرغل پورے قد میں سامنے کھڑا ہو گیا۔ کسی آدمی کا چہرہ دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

"کون ہے"؛ کندن نے فرغل سے چند ہاتھ پر رکتے ہوئے پوچھا۔

فرغل نے کوئی جواب نہ دیا، صرف پچھم سے آنے والی ہوا سے وہ تھوڑا سا ہلا۔ کندن ایک قدم اور بڑھی اور اپنی نظروں کے کیمرے کا تھوڑا "ڈایافرام" کھولتے ہوئے چلائی "باب"

پھر وہ برش، تولیہ وغیرہ پھینکتے ہوئے دونوں بازو پورے پھیلا کر باب کی طرف لپکی۔ باب ساکت و جامد کھڑا تھا۔ کندن اس سے لپٹ گئی "باب...... باب"

باب کے ہاتھ فرغل میں تھے وہ ساکت تھا۔ اس نے کہا بھی تو اتنا۔ "KEEP AWAY"

کندن بھونچکی رہ کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی اور نگاہوں میں معنے لئے بابی فشر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ دن نکلنے لگا تھا اور صبح مشرق کے پرتو میں اس کی آنکھوں کے نمناک کونے دکھائی دے رہے تھے اور چہرے پر گناہوں کے احساس جو بہت سی غیر فانی چیزوں کی طرح سے کبھی نہیں مرتے۔

کندن نے پوچھ ہی لیا "امریکہ سے کب آئے ہے؟"

"واٹ" بابی فشر نے دھیمے سے جواب دیا "بین ایم سے...... پھر مائیکل کی سکا ہیں۔"

کندن ایکا ایکی بھڑک اٹھی۔ غصے اور رقت میں ڈوبی آواز سے بولی "کیوں؟ کیوں آئے تم؟ کیا

ضرورت تھی؟ . . . چلے جاؤ یہاں سے "

بابی فشر جوں کا توں کھڑا رہا۔

کندن نے ہانپتے ہوئے پیچھے کی طرف آواز دی "جیگوار . . ."

جیگوار کندن کے پکارنے سے پہلے ہی بھونک رہا تھا اسے کوئی بو آگئی تھی اور وہ زنجیر تڑا تڑا کر باہر آنے، اس اجنبی کو کچا چبا جانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ کندن اسے کھول کے فادر فشر پہ چھوڑ دینے کے لئے لپکی لیکن پھر لوٹ آئی اور سامنے دکھائی دینے والی برف کی سل پہ یورشیں شروع کر دیں وہ سلیں توڑتا رہی تھیں اور چلا رہی تھیں "باب . . . . باب بولو کچھ تو بولو . . . . . "

کندن کا جسم ساتھ لگتے ہوئے فادر فشر کی پاکیزگی کے ہمالے اور اس کے وطن کے اینڈیز پگھلنے پسیجنے لگے۔ چند لمحے پہلے سردی میں ٹھٹھرنے والے دو جسموں پہ کوئی لحاف سے چلے آئے جنھیں اتار ایک طرف پھینک کر باب بولا "تم عورتیں سمجھتی ہو، مردوں کی عصمت ہی نہیں ہوتی" . . . کندن نے تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے بابی کی روح میں جھانکا اور کانپتی ہوئی منت اور آہ و زاری پہ اتر آئی۔

" میں نے عورت ہو کر تمھیں معاف کر دیا۔ باب . . . . . اور تم . . . . . "

" میرے اور تمھارے درمیان . . . . . میں عورت ہوں "

اور بابی اپنا ہاتھ چھڑا کر سینے پہ کراس پیدا کرتا ہوا چل دیا۔ کندن پھاٹک تک اس کے پیچھے بھاگی پکارتی ہوئی " باب . . . . . باب . . . . . "

اور جب باب نہ پلٹا تو کندن وہیں کھڑی ہو گئی اور اُسے جاتے دیکھنے لگی پھر اسے خیال آیا۔ شاید . . . . .

اور اس نے ایک بار پھر بلند آواز میں پکارا "فا . . . . د . . . . . ر . . . . . " اور اس کی آواز بے شمار گھاٹیوں اور انکی سیاہ تہوں میں گرتی جذب ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

ماں نے باب فشر کو نہ دیکھا تھا " بیٹا تم کس سے باتیں کر رہی تھیں " اس نے پوچھا۔ کندن نے اپنی آنکھوں سے مایوسیاں پونچھ ڈالنے کی بیکار کوشش کی اور نیچے دیکھتی ہوئی بولی " اپنے آپ سے "

لکھی پہ اب تک ان سوالوں کی بوچھار ہو رہی تھی "سچ بتا کون تھا؟ ... یہ گائیڈ کہاں سے لائی"

"تم تو یہ مت پوچھو ماں"

ماں ایکا ایکی ڈر گئی۔ اس نے بیٹی کے چہرے پہ دیکھا اور کچھ مطلب ڈھونڈنے کی کوشش کی

کندن نے بالقصد چہرے پہ ایک معصومیت لاتے ہوئے کہا "ہم عورتیں ہیں ..... ہمیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں، ماں، کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ بچہ ہے .....؟"۔

"اگر پھر لڑکی ہو گئی تو"

"لڑکی کیا انسان نہیں ہوتی..."

"ہوتی ہے مگر ....."

اور پھر سب باتیں ان چند سوالوں میں گم ہو گئیں جو عورت سے ازل سے پوچھے جا رہے ہیں اور ابد تک پوچھے جائیں گے۔ جن کا وہ کبھی جواب دے گی اور کبھی نہ دے سکے گی۔ اور دے گی بھی تو اس پہ ہزاروں دباؤ ہوں گے ... سماجی، اخلاقی اور بچے کو کچھ پتہ نہ ہوگا اور ماں ڈری، سہمی رہے گی۔

گرجے میں لکھی نے "کنفیشن" کیا تو ایک اور صورت پیدا ہو گئی جس نے فادر مائیکل، فادر روبیلو، سسٹر پیریرا انجیلا کو بھگدڑ میں ڈال دیا۔ بابی فشر ابھی تک چپ اور دم سادھے ساری باتیں سن رہا تھا لکھی نے کہا "وہ خواب میں آیا تھا" اس پہ معاملہ اور ابتر ہو گیا "کون" سسٹر انجیلا نے پوچھا۔

کندن بھی وہیں تھی اس نے لکھی کی مدد کرنے کی کوشش کی "سدھو" اس نے کہا مگر لکھی نے نفی میں سر ہلا دیا سب اور بھی حیران ہو کر جواب کے منتظر ہو گئے۔ لکھی نے اچٹتی ہوئی نظر سے سب کی طرف دیکھا پھر آنکھیں جھپکتی ہوئی بولی "رام داس"

کمیٹی اور گرجے کے رجسٹروں میں رام داس ہی کا نام تھا.....

لکھی قسمیں لے رہی تھی جن پر کوئی یقین کرے تو مرے نہ کرے تو بھی مرے۔

عشائے ربانی کی یہ شرکت ختم ہوئی۔ حیران و پریشان کندن نے سسٹر انجیلا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا "خواب میں آیا تھا..... کیا یہ ہو سکتا ہے سسٹر" سسٹر انجیلا نے خود بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک مہمل سا جواب دے دیا۔

"کیوں نہیں ... اگر سچ کہتی ہے ... لکشمی رام داس!"

فرڈا فرڈا فادر روبیلو، اور فادر مائیکل نے بھی کچھ ایسے ہی جواب دیئے گرجے سے باہر سلیبٹ سے بنے ہوئے راستے پہ کندن نے فادر فشر کو پکڑ لیا اور پوچھا "کیا یہ ہو سکتا ہے ...؟"

فادر فشر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر کندن سے کہا "نہیں"

کندن چونک گئی اور بولی "فادر ... تم ایک کیتھولک پادری ہو کر اس بات کو نہیں مانتے ......؟"

"نہیں"

"کیوں نہیں"

اس لئے کہ خدا کے بیٹے اور انسان کے بیٹے میں فرق ہے .... میرا خیال ہے رات کے وقت سدھو چپکے سے چلا آیا ہوگا" کندن کو ماں کا فقرہ یاد آیا "اَپیتی کے سب کام بھگوان اندھیرے میں کرتے ہیں" مگر فادر فشر کو آخر حد تک پہنچانے کے لئے کندن بولی "سدھو یا رام داس؟"

"سدھو"

"رام داس کیوں نہیں؟"

"رام داس کوئی حقیقت نہیں رکھتا ... کوئی وجود نہیں۔ وہ تو صرف نام ہے رجسٹر میں"

"ہاں مگر" کندن نے ضد کی "آیا بھی تو کبھی کو پتہ نہ چلا"

"تم تو جانتی ہو" فادر فشر نے کندن کی نگاہوں کو ٹالتے ہوئے کہا "پھر خواب کتنا گہرا ہو جاتا ہے"

کندن جذبات سے مغمور ہو گئی "بابا" اس نے کہا "اگر تم ان باتوں کو مانتے ہو تو کیوں نہیں یہ مشن چھوڑ دیتے؟ کیوں نہیں شادی"

باب فشر نے کندن کو وہیں روک دیا صرف اتنا کہہ کر "نہیں"

تم کیوں نہیں سمجھنے کی کوشش کرتے بابا۔ اس دنیا کے سب دھندے کرتے ہوئے آدمی پادری سے بھی بڑا ہو سکتا ہے یسوع"

باب نے پھر ٹوک دیا "تم نہیں سمجھ سکتیں"

اور فادر فنشر ایک ایک قدم سے دو دو سلیٹیں پھاندتا ہوا واپس گرجے میں چلا گیا پھر میری کے حضور میں دعائیں کرنے، رات کو اپنے مجرد بستر پر سونے اور روز آدھی رات کو اٹھ کر شیو بنانے اور پھر سو جانے ....اس کے کچھ بعد فادر فنشر ہمیشہ کے لئے لیڈلین دس کو سن چلا گیا جہاں گنہگار کو پاک دامنی کی ضرورت تھی یا کسی پاک دامن کو گنہ گار کی.....

اب کی زچگی کے سلسلے کو بہت کڑی ہدایات تھیں۔ بلکہ کندن نے ایک سستی مگر چیت چالاک سی دایا طے کر رکھی تھی۔ شہر پانچ میل دور تھا اور وہاں کے اسپتال کی بیڈز بعض وقت ارجنٹ کیس کے لئے بھی خالی نہ ہوتی تھیں میٹرنیٹی کا خرچ برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی۔ کندن مدد کر سکتی تھی مگر ایک حد تک ــــــ

مگر لکھی زچگی کے سلسلے میں کوئی بھی معارف کرنے کو تیار نہ تھی۔ ماں سبھاشنی نے سیخ پا ہو کر کہا۔" مر جائے گی کمینی"

"ٹھیک ہے" لکھی نے گھڑا سا سر ہلا دیا" چھٹی ہو جائے گی"

"ان چھوکریوں کو کون سنبھالے گا"

"خدا۔ جس نے پیدا کیا"

"انھیں پیدا کرنے میں تیرا کوئی ہاتھ نہیں"

"نہیں ــ"

اور ناک ناک بھرے ہونے کے باوجود، شرارت سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے لکھی مسکرا دی اس کا مطلب تھا یہ وہی ہے جو ہماری دقت پہ عقل پھرا دیتا ہے اکسی اپنے ہی کھیل کے لالچ میں اور تو سب ٹھیک تھا لیکن پتی دار چہرے والی ریوڑی ابھی بہت چھوٹی تھی اور کندن کو اسکی طرف دیکھ دیکھ کر رحم آتا تھا وہ اب تک ماں کو مکمل طور پر اپنا سمجھے ہوئے تھی، ماں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھی اور ماں ہی اسکی روٹی ــ اسے کیا معلوم چند ہی دن کے بعد لکھی اسے نہ پوچھے گی اس لئے نہیں کہ وہ پوچھنا نہ چاہے گی بلکہ دوسرے بچے کے سلسلے میں الجھی ہونے کے کارن اسے فرصت ہی نہ ہوگی اور اگر کہیں لڑکا پیدا ہو گیا تو.....نہیں اس جنگل کا قانون

لوٹ جائے گا، یہ لکھمی جانتی تھی اور ماں سبھاشنی اور کندن بھی ۔۔۔

دایا دن میں ایک دو چکر کاٹ جاتی تھی تاکہ لکھمی کے چہرے پہ تسکن بھی دکھائی دے تو ماں کو خبر کر دے اس کے ساتھ طے یہ ہوا تھا کہ وقت نبھا گئی تو لکھمی کی تنخواہ سے دس روپئے کاٹ کر اسے دیئے جائیں گے اور میم صاحب کندن بیس روپئے اپنی جیب سے دے گی اور ساتھ میں دھوتی، بلاؤز یا فراک کا کپڑا۔ گیدرڈ اسکرٹ ۔

ایک دن دوپہر کے قریب دایا آئی تو لکھمی ہنس ہنس کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ دایا کو خود بہت اچنبھا ہو ۔۔۔ اس نے تو کوئی ایسی بات نہ کی تھی جس پہ کوئی ہنسے مگر ۔۔۔ اس کے تھوڑی دیر بعد لکھمی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ دایا اس کا منہ دیکھنے لگی اور ڈر گئی ۔۔۔ اس کے پڑوس میں ایسے ہی ایک کنڑی عورت بیٹھے بیٹھے پاگل ہو گئی تھی مگر وہ ہنسنے کے سوا اور کوئی بات نہ کر سکتی تھی لیکن لکھمی ۔۔۔ بات بھی کرتی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ لکھمی کی ہنسی سے دایا مایوس ہو گئی اور سوچتی ہوئی چلی گئی۔ ابھی ہفتہ بھر کوئی خطرہ ہے نہیں۔

دایا کے جاتے ہی لکھمی رونے لگی۔ وہ اتنا ہی روئی تڑپی جتنا وہ ہنسی تھی ۔۔۔ وہ ایک ایسے جری پن سے جو عورت کا ہی حصہ ہے، اپنے درد کو دباتی ہوئی حتٰی کہ شام کے سات بج گئے۔

کندن اسکول سے لوٹ کر ایک کتاب پڑھ رہی تھی ۔ اور کھانے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی ۔ ماں رسوئی کی طرف سے کوئی ضروری بات کہنے کے لئے آئی کہ ایک دلدوز چیخ سنائی دی ۔۔۔

"یہ ۔۔۔؟" ماں نے کہا۔

"لکھمی کی آواز۔" کندن بولی اور پھر دونوں اندھیرے میں لکھمی کے گھر کی طرف دیکھنے لگیں۔ "جائے سرب ناش۔" ماں نے ماتھا اور چھاتی پیٹتے ہوئے کہا۔ "دایا تو کہہ گئی ہے ہفتے بھر کوئی خطرہ نہیں۔" اس کے بعد اور بھی ہو ہائے سنائی دینے لگیں ۔ ماں سبھاشنی کی بے لفظ گالیوں کا تانتا بندھنے لگا۔ بیچ میں جیگوار کے بے تحاشہ بھونکنے کی آواز شامل ہو گئی تھی ۔۔۔

لیکن ماں سبھاشنی پھسکڑا مارے بیٹھی تھی اور اس بات کے انتظار میں تھی کب یہ آواز ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ کندنا زندہ تو اس کتیا کو گھر سے جانے نہ دے گی البتہ مردہ نہ رکھ سکے گی۔ اس نے کندن کو روک لیا ۔۔۔ "اگر تو جائے تو میرا مرا منہ دیکھ ۔"

کندن رُک گئی اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا اور چیخیں سن کر اس کے قدم دروازے

کی طرف اٹھے اور پھر ماں کے ڈر سے رک گئے اس نے ملتجانہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تو پتھر بنی بیٹھی تھی۔ اندر سے وہ کیوں اور کس بات کے خوف سے کانپ رہی تھی اس کا کندن کو بھی اندازہ نہ تھا۔ شاید وہ بھی سل بنی بیٹھی رہتی لیکن ایکا ایکی کھلے دروازے میں ریوڑی چلی آئی روتی ہوتی متوحش اور مادر زاد ننگی۔۔۔۔۔

کندن سے نہ رہا گیا وہ بولی "میں جاؤں گی۔۔۔۔"

"کندنا" ماں نے آواز دی "میں کچھ کھا مروں گی"

اس پہ کندن نہ رکی اور کواڑوں کی طرف لپک گئی۔ ماں کو وہ دن یاد آیا جب اس نے اپنے بھائی امولک رام کے ہاں چلے جانے کی دھمکی دی تھی اور کندن اسے ہمیشہ کے لئے بھیج دینے کے لئے تیار ہوگئی تھی۔ آج اسے ماں کے مرجانے کی پرواہ بھی نہ تھی۔ یہ کیا رشتہ تھا۔ ؟ کندن کا اور لکھی کا ؟۔ سبھاشنی اٹھی اور "رانی" "کچی کنواری" بیٹی کو اس کریہہ منظر سے بچانے کے لئے ریوڑی کو دھکا دے کر باہر نکل گئی۔

دو گھنٹے ماں بیٹی کشتی کرتی ہیں۔ کہیں نو ساڑھے نو بجے تولید ہوئی "حرامی" بچہ پیدا ہو گیا۔ لیکن مرا ہوا۔ وہ لڑکا تھا۔

پیدائش کے فوراً بعد حیات دممات سے بے خبر لکھی ایک تسکین کی میٹھی نیند سو گئی تھی جس کا احساس اس جانکاہی کے بعد ہی ہوتا ہے۔ کندن کو یاد آیا۔ لکھی نے ایک بار کہا تھا "خداوندا! میں ایک لڑکا تو پیدا کر کے دیکھ لوں چاہے وہ مرا ہوا ہی کیوں نہ ہو"

"فادر مائیکل نے بچے کا فاتحہ پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کرسچین بنے بغیر مر گیا تھا وہ زندگی میں شراب اور پانی کے ساتھ اس کا بپتسمہ نہ کر سکا تھا۔ لیکن اسکی اصل وجہ نہ فادر مائیکل نے بتائی نہ فادر ردبیلو نے اور نہ سسٹر انجیلا نے۔۔۔۔۔

ماں نے بنگلے کے دوسرے کونے میں گڑھا کھودا مردہ بچے کو دبانے کے لئے۔ لکھی گھسٹتی ہوئی جرنیک چلی آئی گھر سے شراب کی بوتلوں کا کھوکھا لئے۔ جو بچے کا تابوت ہونا تھا۔ کھوکھے میں ڈالنے سے پہلے لکھی نے بچے کو دیکھا اور جھک کر اس کے لڑکے پن کو چوم لیا۔ اور پھر

دیکھنے لگی وہ رو بھی نہ رہی تھی۔

جب تابوت کو قبر میں رکھ کر اس پر مٹی ڈالی گئی تو وہ لمحوں کا ایک ڈھیر بن گیا۔ ایک ٹیلہ سا لیکن کندن کہاں تھی۔ تھوڑی دیر میں کندن چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں سرو کا ایک پودا تھا جسے وہ جڑوں سمیت کہیں سے کھود لائی تھی۔

"یہ اس پہ لگا دو، ماں۔"

ماں کے ہاتھ سے کھرپی گر گئی اس نے ایک تیز نظر سے یوکلپٹس کے پیڑ کی طرف دیکھا اور پھر بیٹی کی آنکھوں میں ـــ اور پھر اپنے مٹی سے اٹے ہاتھوں کے ساتھ بیٹی سے لپٹ گئی اور زار زار رونے لگی۔

کچھ دیر کے بعد سب باتوں سے فارغ ہو کر ماں سبھاشنی نے کہا "بیٹا! اب تو شادی کر لے۔"

کندن نے ماں کی نظروں میں نظریں ڈالتے ہوئے کہا "تم نے کیوں نہ کی، ماں؟"

"تم جو تھیں ــ میرا سب کچھ۔"

اور کندن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

محمود دواجی

دہلی

عزیز قیسی

خلوتِ انکار و انجمنِ اقرار

تم سن چکے ہو کہا گیا تھا کہ زنانہ کرنا۔ لیکن میں کہتا ہوں جس کسی نے بری خواہش سے عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔

(انجیل مقدس۔ متی۔ باب ۵)

سلینا کو میں کبھی اس حالت میں دیکھوں گا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت اُداس تھی فراک کا رنگ ہلکا نیلا اور کپڑا سادہ تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا اسکارف لپیٹ لیا تھا اور اُس کا تیسرا بچہ جسمیں اس کے ساتھ تھا۔ ماہم چرچ سے نکل کر وہ بس اسٹاپ کی طرف آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھلی تک نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو برس کے بیچ میں اُس نے اپنی زندگی کے دس پندرہ برس گزار لیے ہیں اور اب کچھ باقی نہیں رہا ہے۔

"ہیلو" اُس نے بہت ملائم لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں بڑی گھلاوٹ آگئی تھی۔ میں نے بھی اس کا رنگ دیکھ کر اپنے سارے پر پُرزے سمیٹ لیے اور بہت محتاط ہو کر رسماً پوچھا۔

"کیسی ہو؟"

"فائن!"

"کہاں جا رہی ہو۔"

"گھر"

"البرٹ کیسا ہے۔"

"اچھا ہے۔"

"اور بچے۔"

"سب اچھے ہیں۔"

اب آگے کیا بات کروں میں سوچتا ہی رہ گیا۔ یہ وہی سلینا تھی جو کبھی ملتی تو گھنٹوں بولتے ہوئے تھکتی نہیں تھی اپنے قصے، پرانے قصے اناپ شناپ سب کچھ سُنا دیتی اور یہ حقیقت ہے کہ اس بے اختیاری اور الھڑپن سے سناتی کہ اس کی غیر تعلق اور دلچسپ باتیں بھی سنتے ہی بنتی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پہلے سلینا کا جسم کسی (PRESS) کیے ہوئے کپڑے ریشمی کپڑے کی طرح ہموار اور چمکیلا تھا اب ایسا لگتا تھا کہ جا بجا اس کا بخیہ اُدھڑ گیا ہے اور یہاں وہاں سے سیون بکس گیا ہے۔ اور دھاگے صاف صاف دکھائی دے رہے ہیں اس کے چہرے پر بھی شامو کی اُس شلوار کا گمان ہوتا تھا جسے پہن کر کوئی کنواری بے چین نیند سوئی ہو۔ کچھ لمحوں کی ناگوار خاموشی کے بعد میں نے پھر ابتدا کی۔

"تم بیمار ہو گئی تھیں کیا۔"

"نہیں میری روح بیمار ہو گئی تھی۔"

"روح"، میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا "تم آج بہت بوڑھی لگ رہی ہو۔"

اب کے وہ ہنسی "کب تک بوڑھی نہ ہونگی۔"

پھر وہی منزل آگئی کہ آگے کس طرح بات کی جائے۔ عمر کا موضوع سلینا کا پسندیدہ موضوع تھا ہزار داستانوں کو ڈھکنے کے لیے یہ موضوع کافی تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی یہ گفتگو ہوتی وہ اپنی کم عمری کے پچاسوں ثبوت دے ڈالتی۔

"اب ہی سنو کل میں شاپنگ کے لیے گئی۔ اینا میرے ساتھ تھی اب اینا دس برس کی ہو رہی ہے۔ جانتے ہو دکان دار نے کیا کہا۔"

"کیا"

"میڈم یہ آپ کی چھوٹی بہن ہے کیا۔"

"نہیں میری بیٹی ہے" میں نے سادگی سے جواب دیا بھلا بتاؤ میں کیوں جھوٹ بولتی۔

"میں نہیں مانتا"

اب بتاؤ کیسے مناتی اس شخص کو۔ اور اُسی کو کیا۔ ہمارے ہاں وہ بائی ہے نا۔ جو جھاڑو لگاتی ہے۔

"کیوں"

وہ کہنے لگی "میم صاحب آپ اگر اپنے بچوں کو ساتھ نہ لے جائیں تو ابھی آپ کو شادی کا آفر آسکتا ہے" مجھے ایسے کتنے ہی قصے یاد آگئے اور اب کی بار ہمت کر کے میں نے اُسے چھیڑنا چاہا۔

"جیمس کو ساتھ لیے کیوں نکلی ہو؟"

"بچے کو ماں ساتھ نہ رکھے تو اور کس کو رکھے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ ساتھ نہ ہوتا تو اب بھی میں تمہیں شادی کا آفر دے سکتا تھا"

سلینا کے لئے یہ تلمیح واضح تھی وہ بجھے بجھے انداز سے مسکرائی "تم اگر آفر دینے والے ہو تو جیمس کو چھوڑ آؤں البرٹ کے پاس؟"

بڑی دیر بعد پچھلی سلینا بڑی بے دلی سے اُس کے اندر سے جھانکی۔ میں نے اُسے وہیں روکا اور ہنس کر جھانے لگا۔

"تم اپنی عمر کے کسی بھی حصے میں آسکتی ہو میرے پاس۔ میرے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے تم پر کھلے ہیں" پچھلی سلینا کھلی نہیں اُداس ہو گئی اور جیسے اُس نے کہا "سب ایسے ہی کہا کرتے ہیں"

"سنو" میں نے بڑی سنجیدگی سے اُسے مخاطب کیا۔

"کیا ہے"

"تم بدھ کے دن چرچ کیوں آئیں۔ کیا (NOVENA) کر رہی ہو"

"ہاں۔ تین بدھ گزر چکے ہیں۔ چھ اور باقی ہیں"

"کس کے لیے نوینا کر رہی ہو"

"اپنے لیے۔ اپنے گناہوں کو دھونے اور البرٹ کو نیک بنانے کے لیے مقدس ماں کے آگے دعا کر رہی ہوں"

"تم نے کیا گناہ کیے"

"چھوڑ دنا اس بات کو۔"

"چھوڑ دیا۔"

اس سیدھے سادے سوال اور جواب میں ان دو چار راتوں کو میں نے بے چین دیکھ لیا جن میں سلینا نے مجھ سے کہا تھا کہ جسم گناہ نہیں کرتے۔ روحیں گناہ کیا کرتی ہیں اس لیے ہم دونوں پاک ہیں۔" اتنے میں بس آگئی ورنہ شاید سلینا میری نظروں کی تاب نہ لا سکتی۔

"میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"NO - پھر کبھی آنا۔"

مگر میں اُس کے ساتھ بس میں چڑھ گیا اور جب وہ بیٹھ گئی تو مجھے اُس کے برابر بیٹھتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی کیونکہ اُس کے جسم میں بھی ایک بیزاری کی کیفیت تھی اور وہ بھی میری ہم نشینی سے خوش نہیں تھی۔

ہم دونوں بس میں بیٹھے رہے اور معصوم جیمس ہم دونوں سے بے خبر بس کی کھڑکی میں کھڑا سڑک کا تماشہ دیکھ رہا۔ جیمس کو کیا خبر کہ ہم دونوں بھی اس وقت اسی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک بڑا پُر شور تماشہ دیکھ رہے تھے جس میں سلینا کے اور میرے تعلقات کی بڑی معصوم اور گنہ گار داستان تھی بڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد شاید وہ مجبور ہو چکی تھی کہ کچھ کہے اور اس نے بڑی نرمی سے کہا۔

"اگر اس وقت البرٹ ہم کو دیکھ لے تو کیا کہے گا"

"جو ساری بس کے مسافر اپنے دلوں میں کہہ رہے ہوں گے۔ کیا خوبصورت جوڑا ہے GOD BLESS THEM وہ اس شوخی پر ذرا بھی نہیں چونکی نہ اس فقرے پر اُس نے کوئی رد عمل ظاہر کیا بڑی سادگی سے اس نے کہا" البرٹ جل جائے گا۔"

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ضرور کوئی (SERIOUS) بات ہوگی البرٹ اور سلینا کے درمیان "البرٹ اور جلے گا۔" میں نے اُس سے بڑا مطمئن سوال کیا۔

"ہاں،" وہ بھی مطمئن تھی۔

"پر وہ تو خوش ہوتا تھا تمھیں دوستوں میں گھرا دیکھ کر۔"

"ہاں"

"پھر یہ کیسے ہوا"

"جاننا چاہتے ہو تو کسی اتوار کی رات کو آنا۔ جب البرٹ نہیں ہوتا آج میں اس موڈ میں نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ میں اگلی اتوار کو آرہا ہوں۔"

روئیں روئیں میں آچکی ہے اور اب البرٹ کا جسم گونگا ہو چکا ہے — ان دنوں سلینا دارو کا دھندہ چلا رہی تھی۔ البرٹ میں یہ تبدیلی کیوں آئی تھی سلینا اس سے واقف نہیں تھی۔ وہ تبدیلی کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ ایک رات جب ٹھرّے کے گاہک رو کر ہنس کر غل مچا کر رخصت ہوئے — اور کمرے میں وہی سردی چھا گئی جو البرٹ کی آنکھوں میں تھی اُس نے فرش سے بیڑیوں کے ٹکڑے، سگریٹوں کے ٹوٹے۔ پیک تھوک، مونگ پھلی اور چنوں کے چھلکے، بھجیے پکوڑوں کی ریزگاری، مٹن مچھلی کی ریزش اور الا بلا کو جھاڑتے ہوئے سوچا فادر ٹھیک کہتا تھا۔

”آدمی دو مالکوں کی کبھی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبّت یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی بہ یک وقت خدمت نہیں کر سکتے“

سرمن کا یہ حصہ اس کے ذہن سے حرف بہ حرف پیوست ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اُس کے حسب حال تھا۔ اُس نے سوچا اس کے گاہک دو چار روپے کا ٹھرّہ خرید کر اس سے کیا کیا کام لیتے ہیں۔ آدھی رات ڈھلے تک وہ اُن کے اچھے بُرے مباحث اور تذکرے غور سے سُنتی ہے ان کے گلاسوں میں بار بار شراب اور دال دو انڈیلتی ہے۔ ان کے لیے گزک اور دل بستگی فراہم کرتی ہے — ان کے گندے مذاق اور فحش لطیفے سن کر اوپری دل سے دل کھول کر ہنستی ہے اور انھیں تہِ دل سے معاف کر دیتی ہے۔ ان کی نظروں کی بلیڈس اس کے جسم پر چلتی رہتی ہیں اور وہ اُن کو رجھاتی رہتی ہے ایک آدھ بار تو اندھیرے اجالے میں کسی ٹھرّے کے گاہک نے ٹھرّے کے علاوہ بھی کوئی اور شئے اس سے مانگ لی تھی۔ بلکہ زبردستی کوئی شئے اُس کے ہونٹوں سے چُرا لی تھی اور وہ محض اس خیال سے چپ رہی کہ البرٹ سے کہے گی تو وہ الٹا اسی کو برا بھلا کہے گا۔ گاہکوں کو کہے گی تو دھندہ بیٹھ جائے گا۔ اور آمدنی کا دریا سوکھ جائے گا۔ اور پھر یہ بھی حقیقت تھی کہ ان گاہکوں میں بیشتر تو البرٹ کے دوست تھے۔

اس کے دل میں یہ خیالات اجنبی سے تھے۔ وہ کبھی بھی جسم اور گناہ کے معاملے میں اس انداز سے نہیں سوچتی تھی۔ نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی بھی اس میں البرٹ کی وجہ سے آئی تھی۔ ورنہ وہ اور اتنی سنجیدہ باتیں سوچے۔ یہ ناممکن تھا۔ اس نے سوچا البرٹ کہیں اسی لیے تو خفا نہیں کہ آج کل وہ دھندے میں بہت دلچسپی لے رہی ہے اور اس کے گاہک بڑھتے جا رہے ہیں۔ البرٹ کو تو خوش ہونا چاہیے

"ضرور آنا"، یہ شاید اس سلینا نے کہا تھا جو اس وقت موجود نہیں تھی۔

اگلی اتوار کو سلینا کے کہنے کے برخلاف البرٹ گھر پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر جیسے وہ کھل اٹھا۔ گلے لگا کر اس نے کہا "ڈیر۔ بہت دن بعد آیا۔ مگر آیا تو سہی۔ یہی کافی ہے۔ مگر میں بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ اور رات پھر نہیں لوٹوں گا۔ تو آرام سے بیٹھ سلینا سے باتیں کر۔ تم لوگ بھی تو بہت دنوں ملے نہیں ہو۔"

"ہاں وو ڈھائی برس بعد ملے ہیں آج"، میں نے بدھ کی ملاقات کو آسانی سے نکال پھینکا۔ اور سلینا بھی چپ رہی۔

"سلینا"، البرٹ نے اس سے بڑے پیار سے کہا "اسے پلاؤ۔ کھلاؤ۔ اس سے باتیں کرو اور مری کمی محسوس ہونے نہ دو۔ سمجھیں"، چلتے جاتے وہ پلٹا "اور ہاں تم وقت پر کھانا کھا لینا تمہاری صحت ٹھیک نہیں۔ اچھا ڈیر میں چلا"، اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

خدا گواہ ہے میرے لیے البرٹ بالکل وہی البرٹ تھا اس کے پیار اور خلوص میں میں نے ذرہ برابر فرق نہیں پایا اور کچھ لمحوں کے لیے مجھے سوچنا پڑا کہ سلینا کہیں کسی وہم میں تو مبتلا نہیں۔ لیکن سلینا وہم میں مبتلا نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا اس سے پتہ چلا کہ میں اب تک وہم میں مبتلا تھا۔ بڑی سادگی، خلوص اور اثر کے ساتھ اس نے جو واقعات سنائے وہ کچھ اس قسم کے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان واقعات میں ترتیب، تسلسل اور ایکشن نہ ہو۔ تاثرات اور تجزیے زیادہ ہوں۔ میں تاہم انھیں اپنے لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

دو برس پہلے کی بات ہے کہ البرٹ خداوند سے پھر گیا تھا اور اب نہ رات کی دعاؤں میں خلوص باقی تھا نہ آہِ سحر گاہی میں۔ اگرچہ اُس نے ابھی اس دلی کیفیت کا اظہار کبھی سلینا سے نہیں کیا تھا مگر سلینا جو آنکھوں کی کتابیں فرفر پڑھ لیتی تھی اور جو کبھی کبھی نہ دیکھتے ہوئے بھی لوگوں کی دلی کیفیات بھانپ لیتی تھی سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ البرٹ کے دل کی یہ سردی اس کے بدن کے

"خداوند! مجھے معاف کر دے۔ تو تو جانتا ہے کہ میں ہر کام البرٹ کو خوش کرنے کے لیے کرتی ہوں" اس نے ٹیبل سے غلاظت صاف کرتے ہوئے یسوع کو دیکھا جو صلیب پر لٹکا ہوا تھا اور اس کے نیچے ریشم کے کپڑے پر کڑھا ہوا:-

SACRED HEART OF JESUS

BE MERCIFUL UPON US

صاف چمک رہا تھا۔ اس کے نیچے دکھیاری ماں کی مغموم نظریں سلینا پر پڑ رہی تھیں اُس نے جھاڑو نیچے رکھی سینے پر کراس بنائی اور آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔

"دکھیاری ماں ہم پر رحم کرو۔ اپنے مظلوم بیٹے سے ہماری سفارش کرو۔ آسمانی باپ کو ہمارے لیے رضامند کرو۔ میرے اور البرٹ کے بچوں پر مہربان ہو۔ یہ سب میں البرٹ کے لیے کر رہی ہوں اور وہ مجھ سے ناراض ہے۔ اس کے دل کو روشنی دو"

لیکن البرٹ کے دل کو روشنی نہیں ملی۔ دعا کرنے کے بعد اُس نے زیتون کے تیل میں سوئی ہوئی بتی کو جگا دیا اور اپنے کمرے کی طرف چلی۔ جہاں سے البرٹ یہ سب دیکھ رہا تھا۔ البرٹ نے آنکھیں زبردستی بند کر لیں۔ سلینا نے اُس کی ٹانگوں پر چادر ٹھیک کی اور پھر خود اُس کے پہلو میں لیٹ گئی۔ نیچے اس کی بچی اینا اور پیٹر سو رہے تھے جیمس ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے البرٹ کے سینے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی البرٹ نے اس کی طرف پیٹھ کر دی۔ سلینا جانتی تھی کہ اگر اس نے اُس کو اور اُکسایا تو وہ جھنجھلا جائے گا اور پھر ایسی تلخ باتیں سنا دیگا کہ وہ ہفتوں رویا کریگی۔

لیکن وہ کیا کرے البرٹ کو اس نے جہاں تک یاد ہے کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔

"آخر کیا قصور ہوا ہے مجھ سے کونسی بھاری غلطی کی ہے میں نے جو البرٹ اس طرح ناراض ہے" اس نے سوچا۔ ورنہ تو اس گھر کا یہ دستور تھا کہ البرٹ رات کی تنہائی میں وہ سب کچھ کہہ دیتا جو ایک شوہر کو کبھی نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن محفل میں وہی البرٹ بے حد نرم کلام اور شیریں زبان ہوتا اور اس کی گفتگو سے خود سلینا بھی بھول جاتی کہ ابھی ابھی اُس نے تنہائی میں اسے "رنڈی" کہا ہے۔

جب لوگ موجود ہوں، تو البرٹ سلینا کو معمولی سے معمولی کام بھی کرنے نہ دیتا۔ لوگوں نے تو یہاں تک دیکھا تھا کہ سلینا کی فراک کی کریس وہ بار بار درست کر رہا ہے اس کی ربن کی گرہ ٹھیک کر رہا ہے۔

اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہا ہے۔

دوستوں کی محفل میں سلینا کو وہ اس محبت سے پکارتا کہ اہل محفل اپنے دلوں میں شرمندہ ہوجاتے۔ وہ جو سلینا کو چاہتے تھے سوچنے پر مجبور ہوتے کہ ان کی محبت بے سروپا ہے وہ البرٹ کی طرح سلینا کو کبھی نہیں چاہ سکتے۔ ابتدائے عمر میں جب البرٹ اور سلینا کو رٹ شپ کر رہے تھے تو کئی رقیبوں نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی تھی ان میں خود میں بھی شامل ہوں۔

سلینا کو البرٹ پر اتنا اعتماد تھا اُن دونوں کہ وہ ہر ایک چاہنے والے کی ناقابلِ بیان باتیں بھی اس سے بیان کر دیتی اور ہر واقعے کے تذکرے پر اسے ایسا محسوس ہوتا کہ البرٹ اور شدت سے اسے پیار کرنے لگا ہے۔ یہ شاید سچ بھی ہے کہ سلینا کے بے شمار چاہنے والوں نے البرٹ کا پیار اسے دلایا تھا۔ البرٹ کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ سلینا کے لیے بس وہ ہی وہ رہ گیا ہے تو ممکن ہے کبھی وہ سلینا کے لیے نہ تڑپتا۔

اُن دونوں کے عشق کی کہانی جس قدر میں جانتا تھا بس اتنی تھی کہ البرٹ نے اُسے دیکھا اُسے تراشا۔ اُسے پوجا اور اُسے توڑ دیا ——— اور یہ سب شادی سے پہلے ہو چکا۔

جس رات سلینا ٹوٹی تھی وہ اُس کی سہاگ رات تھی۔

چرچ سے واپس آنے کے بعد ہلکے ہلکے نشے میں ہلکے ہلکے اجالے نے ذرا سا اشتعال پیدا کیا تو سلینا نے البرٹ سے لپٹ کر کہا "خداوند کی ہم پر رحمت ہوئی۔ ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے"

اور نشے کا اثر تھا یا شادی کا۔ البرٹ نے پہلی بار سخت لہجے میں کہا۔

"ہم ایک دوسرے کے نہیں ہوئے۔ تم آج میری ہو گئیں"

سلینا چونکی۔ آخر اس جملے کا مطلب کیا تھا۔ کیا سلینا اُس کی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ کیا یہ شادی صرف البرٹ کی آرزو کا نتیجہ تھی۔

"کیا میں اب تک تمہارے سوائے کسی اور کی تھی"

"اب تک جانے تم کن کن کی تھیں"

"البرٹ ڈیر کیا کہہ رہے ہو تم"

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تمہارے بیسیوں چاہنے والے ہیں۔ جنھوں نے تم کو ہزار بار کہا ہم تمہارے ہیں۔ جنھوں نے تمہارے ہاتھ چومے۔ پاؤں چومے۔ اور......"

"اور یہ سب میں نے ہی تم کو بتایا۔" وہ رو پڑی۔ "مجھے دیکھو میں نے کوئی بات نہیں چھپائی تم سے۔"

"تم نے کبھی کسی کا دل نہیں توڑا۔ کسی کو ٹھکرایا نہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم نے کسی سے کھلا کھلا انکار نہیں کیا۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی تھی البرٹ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ "تم تو میری ہر عادت سے واقف ہو۔ میں ان کلچرڈ نہیں ہوں۔ ان لوگوں نے ہاتھ چومے پاؤں چومے چاہے جو بھی کیا پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ گناہ تو روح کا ہوتا ہے البرٹ۔ اور میری روح پاک ہے۔ یہ سب تو بہتے پانی پر پڑنے والی گندگی تھی البرٹ۔ پر تم نے میرا دل توڑ دیا۔ آج تک میں صرف تمہاری تھی۔ آگے شاید سب کی ہو جاؤں گی۔ تمہاری نہیں۔"

وہ بے اختیار رو رہی تھی۔ اور البرٹ جس نے اسے روتے ہوئے بہت کم دیکھا تھا۔ اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

"پاگل۔ میں تو یونہی کہہ رہا تھا اور محبت مانگنے کے لیے۔ ورنہ میں جانتا ہوں تم کلچرڈ ہو نرم دل ہو۔ کسی کا دل نہیں توڑ سکتیں۔ میں خود نہیں چاہتا کہ تم ان کلچرڈ کہلاؤ۔ میں تو چاہتا ہوں کہ تم دشمن سے بھی ہنس کر ملو۔ ہر ایک کے دل پر اس طرح چھا جاؤ کہ وہ تمہیں زندگی بھر نہ بھلا سکے۔"

اور پھر اُس نے ایسی حرکت کی کہ سلینا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اُس کی ہنسی کے ساتھ کمرے کی ہلکی ہلکی روشنی جانے کیوں اور مدھم پڑ گئی اور سلینا جیسے اس وقت بھول گئی کہ وہ ٹوٹ ٹوٹ چکی ہے۔

سلینا اُس رات کے بعد ہر صبح بھولنے لگی کہ رات کو البرٹ نے اسے کیا کیا کہہ دیا ہے اور اس بھولنے میں سلینا کی کوشش بہت کم ہوتی۔ اس لیے کہ البرٹ موڈس بدلنے میں بے نظیر تھا۔ وہ خود بھی ہنستے ہنستے رو سکتا تھا اور روتے روتے ہنس سکتا تھا اور یہی مہارت وہ دوسروں پر اور خاص طور پر سلینا کو ہنسانے اور رُلانے پر صرف کیا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ کب تک چلتا رہا خود سلینا بھی نہیں بتا سکتی۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے یہ سلسلہ ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔

البرٹ کی اس مہارت کو جب سے سلینا سمجھنے لگی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ سہاگ رات کے بعد سے آج تک وہ ریزہ ریزہ ہے۔ اور بت تراش محض پلستر چڑھاتا اور رنگ چپکاتا رہتا ہے ـــــ ان دنوں اپنی شکست کا اسے واضح اندازہ تھا اور یہ اندازہ بھی خود البرٹ نے اس میں پیدا کیا تھا۔

یہ سب سوچ کر سلینا نے البرٹ کو دوبارہ چھیڑا۔ اس نے کہا "میں آج پوچھ سکتی ہوں

گی کہ تم اتنے خفا کیوں ہو۔"

"البرٹا نے کروٹ بدلی اور کہا کہ "تم جانتی ہو میں کس لیے خفا ہوں" جب سلینا نے اسے یقین دلایا کہ وہ بالکل نہیں جانتی تو البرٹ نے اپنے مخصوص مختصر اور جامع انداز میں کہا۔

میں ریس میں روپئے ہار چکا ہوں۔ دارو کا دھندہ چلانا ہو تو انسپکٹر کھنّہ کو ہزار روپے معمول دینا ہی چاہیئے۔ اور تم اب تک کھنّہ سے نہیں ملیں۔"

"البرٹ میں مل کر کیا کروں گی اس سے۔"

"نہ ملو۔ بھوکوں مرو۔ بچوں کو فاقے کرنے دو۔"

اسے اب کچھ سمجھ ہی آیا۔ "تو ملتی ہوں کل ہی اس سے۔"

"ہوں" البرٹا نے اپنا فیصلہ سُنایا۔ "اس کے دل میں تمھارے لیے SOFT CORNER ہے۔"

اُن دونوں میں اس سے پہلے بارہا ایسی باتیں ہوئی تھیں۔ البرٹ جانتا تھا کہ سلینا میں کیسی کیسی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں اور سلینا جانتی تھی کہ ان صلاحیتوں کے استعمال پر البرٹ کتنی دور تک چشم پوشی کر سکتا ہے۔ لیکن شاید اب کی بار اتنے دن تک اُس سے یہ مطالبہ کرتے اس لیے ہچکچاتا رہا کہ سلینا جا و بے جا فادر کا سرمن دہرانے لگی تھی۔

"بے چارہ البرٹ" سلینا نے کہا۔ "وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ میں اس کے لیے کیا کیا کر سکتی ہوں" کھنّہ صاحب نے دوسرے دن ایک ہزار روپے کا معمول معاف کر دیا۔ اور دارو کے دھندے کو حسب معمول چلنے کی اجازت دے دی۔

مگر سلینا کی دنیا ہی بدل گئی جب البرٹا نے اسے معاف نہیں کیا۔ اور یہ اس کہانی کا آخری اور مختصر باب ہے۔

پھر جو رات آئی تو البرٹ نے اپنے مخصوص مختصر اور جامع لفظوں میں سلینا سے کہا۔ "تم اب برداشت سے باہر ہو گئی ہو۔ تمھاری روح گنہ گار ہے۔ تمھارا جسم آلودہ ہے۔ اور تم اب میرے قابل نہیں رہیں۔ اولاد جو تمھاری میری مشترک ہے اسی طرح رہے گی۔ اور تم اس گھر کی تنہائی میں میرے لیے اجنبی عورت ہو جس کو میں چھو بھی نہیں سکتا۔ لیکن میں ان کلچر ڈ ہونے کا الزام نہ تم پر لگتا ہوا سُن سکتا ہوں نہ مجھ پر۔ اس لیے تم دن کے اجالے میں، محفل میں، میری بیوی ہو، لیکن دل ضمیر اور خداوند کے حضور تم مجھ پر ایسی ہی حرام ہو جیسی میری ماں۔"

میں اس روداد کے اس حصے پر اس طرح بیٹھا رہا جیسے میں انسان نہیں وہ چمگادڑ ہوں جو کسی بجلی کے تار میں لٹک رہا ہو۔

میں نے سلینا سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ جیمس تم دونوں کا مشترک بچہ ہے یا نہیں۔ سلینا روتی ہوئی اٹھی۔ اس سے یہ بھی میں نہیں پوچھ سکتا تھا کہ تم رومن کیتھولک ہو۔ اور تم میں شاید ایسا عہد نہیں کیا جا سکتا۔"

اُس نے کہا "اس رات سے دارو کا دھندہ میں نے بند کر دیا ہے۔۔ اور اب ہم غریبی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے آسمانی باپ کو غریبی عزیز ہے۔ اور اب میری NOVENA کر رہی ہوں۔ دو برس سے ہم اجنبیوں کی طرح رہتے ہیں۔ پھر اس نے میری کا کی تصویر کے آگے کھڑے ہو کر آنکھیں بند کیں اور آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے، اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، جانے وہ کیا کیا کہہ رہی تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے وہ کہہ رہی ہوگی۔

"دکھیاری ماں۔ مقدس ماں۔ تو تو جانتی ہے کہ میں کنواری ہوں۔"

قاضی عبدالستار

حرفوں کی صلیب

کالی رات کوہ پیکر پیاسی کتیا کی طرح تارکول کی سیاہ سڑک کی زبان نکالے پڑی ہانپ رہی ہے میری تنہائی کے مقدر سے اگر کوئی راہی ..... فرشتے کی طرح آسمان سے اتر پڑتا ہے تو اس کے مانوس اور چارہ گر قدموں کے لمس کو چیڑ چیڑ کر کے پی جاتی ہے اور پھر دوسرے فرشتے کے انتظار میں زہریلی سسکاریں بھرنے لگتی ہے۔ اور اس کی مبہم سرسراتی آواز کی سیاہی میرے کمرے ..... میرے سارے وجود کو اپنی تاریک چادر میں ڈھانپ لیتی ہے۔ جس سے تنہائی کے بس کی بدبو ٹپک رہی ہے .... ایک ایک پرچھائیں لانبے دریچے کی مدت سے بھوکی سولی پر چڑھ کر خودکشی کر لیتی ہے .... ایک ایک خواب کے ستارے کی ہچکیاں لیتی روشنی طلاق کی ماری عورتوں کی طرح اپنے گھر سے اپنا منھ کالا کر لیتی ہے۔ ایک آواز کا زخمی سایہ میری چارہ گری کی لاش اٹھائے لنگڑاتا ہوا کراہتا ہوا اپنے مدفن کی طرح رینگ جاتا ہے ..... اپنے کمرے کے اندھے تہ خانے میں عمر قید کے قیدی کی طرح اپنی سانسوں کی خاموش زنجیروں میں جکڑا ہوا موت کے قدموں کی چاپ کے انتظار میں سر سے پاؤں تک ایک چونکتے کان کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہوں ..... کئی زمانوں ..... کئی یگوں ..... کئی صدیوں سے بیٹھا ہوا ہوں ..... صدیاں جن کے شفاف چہرے پر مجھ ایسے کروڑوں انسانوں

کے لہولہان قدموں کا کوئی نشان نہیں کوئی چراغ نہیں کوئی داغ نہیں . . . صدیاں جو اپنے سینے پر چنگیزوں اور تاردونوں اور افلاطونوں کے خنجروں کے زخم لئے تاریخ کے تابوت میں بیٹھی ان عورتوں کی طرح رو رہی ہیں جن کے شوہر ان کے ہاتھوں سے چوڑیاں اتار کر اور ان کے جسموں پہ کوڑوں کی گلکاریاں کر کے تاڑی کے کھجور توڑنے چلے گئے ہیں اور وہ ان کے انتظار میں سوکھی روٹی اور باسی چٹنی لئے بیٹھی اپنی بھوک سے بے نیاز ان کی بھوک کے غم میں رو رہی ہیں ۔

"دستک اتنی زور سے نہیں دیتے بھائی"

"اگر اس رات کمبخت منحوس رات نے سُن لیا تو تمہارے ساتھ مجھے بھی پھاڑ کھائے گی"

"تم کون ہو ؟ جو رات کی کالی آنکھوں کے سامنے سے روشنی کی یہ چادر اٹھا لائے ہو"

"ادھر نہیں . . . یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ . . . . . . اس کرسی کی پشت ٹوٹی ہوئی ہے اور سُتلی کے سہارے ٹکی ہوئی ہے . . . . جیسے لاکھوں زندگیوں کے کروڑوں دیدان بس ایک ان دیکھی سانس کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں"

"یہ پرانا کپڑا زمین پہ نہ ڈالو . . . . یہ بوسیدہ کپڑا میرے یقین کے مصحف کا جزدان ہے . . . . جس میں صدیوں سے لپٹا ہوا آسمانی صحیفہ کوئی لڑکا اٹھائے گیا ہے ۔ اور اب میں اسی جزدان کا منہ دیکھ کر . . . . چھوڑو یہ رام کہانی . . . . . "

"تو تم میری بیوی شری متی "کلا" سے ملنے آئے ہو ؟"

"ہونہہ . . . . . کلا"

"کلا تو اسی دن مر گئی"

"بیٹھ جائیے . . . . . پریشان ہونے کی اداکاری میں آپ سے اچھی کر سکتا ہوں ۔ کوئی کسی کے لئے پریشان نہیں ہوتا . . . . . سب اپنی اپنی غرض کے لئے"

"ہاں . . . . . میں یہ کہہ رہا تھا کہ کلا جس دن میری بیوی بنی اس دن مر گئی . . . اور میری بیوی نے جس دن میرے ہونے والے پوتوں کے باپ کو جنم دیا . . . . اس دن مر گئی . . . . اور اب وہ صرف ایک ماں ہے جو اپنے ننگے بچوں کے جسم سہلاتی رہتی ہے اور ان کے بھوکے پیٹ میں آنسوؤں کی روٹیاں ، سلم نمکین ، گرم تازی روٹیاں اتارتی رہتی ہے"

"زندہ ہے اس لئے کہ موت نہیں آتی"

"موت اس لئے نہیں آتی کہ اس پہ کوئی زہر کام نہیں کرتا . . . . تمہاری دھواں دھار انجن کے

مانند دندناتی تہذیب کے ایک ایک زہر کے دس دس پیالے چڑھا چکی ہے۔ لیکن اسی طرح رینگ رہی ہے ... بسک رہی ہے۔"

"جی؟ میں دو منٹ کے لئے اسے دو گھنٹے کے لئے ٹلا دوں گا۔ لیکن آپ اپنا۔"

"اچھا.... اچھا آپ خنجر کمپنی کی دواؤں کے ایجنٹ ہیں.... تو ڈاکٹر آپ ضرور ہوں گے اور سچ پوچھیئے تو ڈاکٹروں کا کیا ہے۔ کوئی بھی مسخرہ پانچ برس تک پروفیسروں کے جوتوں پر پالش کر کے ڈاکٹر بن سکتا ہے لیکن دواؤں کی کمپنی اور وہ بھی خنجر کمپنی کا ایجنٹ ہونا۔ جی کیا فرمایا.. جنرل ایجنٹ ہونا ایک بات ہوئی ... لاکھ روپئے کی ایک بات ہوئی ... تو پھر آپ کوئی ایسا زہر تجویز کر دیجئے کہ میرے بچوں کی ماں کلا کا قصہ ختم ہو جائے۔"

"خوب .... آپ کی کمپنی نے دبلا ہونے کی دوا بنا کر بڑا احسان کیا ہے ہم لوگوں پر .... کھا کھا کر کس قدر موٹے ہوئے جا رہے ہیں ہم لوگ ...."

"کلا کی تصویر۔"

"جی ہاں کلا کی سوتیلی ماں لکشمی ہی کا وہ اسٹوڈیو ہے جہاں سے آپ کو وہ تصویر مل گئی۔"

"اچھا.... یعنی اب آپ کے مریضوں کا مٹاپا کلا کی تصویر ہی دیکھ کر چلا جاتا ہے ...... دوا کھانے کی بھی ضرورت نہیں .... جواب نہیں ..... کس قدر حساس ہو گئے ہیں یہ موٹے لوگ بھی۔"

(بالکل عوام معلوم ہوتے ہیں کہ ایک روپیہ سیر کا گیہوں خریدتے ہیں مگر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ مل تو جاتا ہے)

"یہ جناب جملہ حقوق والی بات میری سمجھ میں آتی نہیں۔"

"اچھا میں نے صرف آپ کو.... یعنی آپ کی فرم کو کلا کی تصویر چھاپنے کی اجازت دے دی تو؟"

"یعنی .... آپ .... مجھے دس لاکھ روپیہ دے ڈالیں گے؟"

"دس لاکھ۔"

"دس لاکھ۔"

"دس لاکھ روپیے کو میں خرچ بھی کر سکتا ہوں؟"

"میں نے اس لئے پوچھ لیا کہ تاشوں میں مداریوں نے مجھے سونے کی اشرفیاں تک دے ڈالی ہیں۔ لیکن جب میں ان کو خرچ کرنے بازار گیا تو پتہ چلا کہ اپنی جیب کے تلنے کے ٹکڑے بھی

کہیں یہ لگا کر اُڑ گئے ہیں۔"

"اگر آپ سوچنے کی یہ مہلت . . . صدیوں پہ پھیلی ہوئی مہلت کے بجائے مجھے تھوڑے سے سکّے دئے جاتے تو میں پیٹ بھر کر سوچتا" خیر!!"

"کل . . . . کل صبح آپ آجائیں گے نا؟ . . . . واقعی آجائیں گے؟"

"ذرا میرے منھ پہ ایک تھپڑ ماریئے۔"

ماریئے تو . . . تکلف نہ کیجئے . . . . میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں سو نہیں رہا ہوں۔ خواب نہیں دیکھ رہا ہوں . . . . ہوائی قلعوں میں بند شہزادیوں کے سرخ ہونٹوں پہ بوسے نہیں دے رہا ہوں۔"

"شکریہ۔"

"شکریہ۔"

"ضرور . . . ضرور . . . . . میں یہ تصویر کلا کو ضرور دکھلاؤں گا۔"

"آداب عرض جناب، آداب عرض۔"

یہ تصویر تو سچ مچ کلا کی ہے۔ بالکل وہی صورت۔ وہی پتلا پتلا۔ چمچے کی طرح ٹین کا منھ جس کے دونوں طرف رخساروں کی ہڈیوں کے بریکٹ ہیں۔ وہی ڈھیلا ڈھالا نقشہ جیسے جھولے سے ترکاری نکال لی گئی ہو۔ وہی . . . گدڑی بازار سے ٹکے میں دو دو خریدی ہوئی۔ آنکھیں ٹٹیری مرغ کی طرح پھڑک رہی ہیں۔ وہی لجلجا سا تاثر جو مرچوں سے لال چٹنی کو سیٹھا پھیکا بنا دیتا ہے۔ جب میں اس کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہونے کا گناہ کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک ایسی قبر میں آگیا ہوں جس کی لمبی چوڑی اندھیری تنہائی میں ایک مردہ کفن پھاڑے پھٹی ہوئی جیبوں کی طرح آنکھیں کھولے مجھے گھور رہا ہے۔ اور میرے جسم کی ہڈیاں پگھل کر میرے چہرے پر قطرہ قطرہ بہنے لگتی ہیں۔

لیکن . . . . لیکن یہ ساری دنیا۔ پڑھی لکھی عاقل بالغ دنیا جو اخبار خریدتی ہے اور پڑھتی ہے اور کلا کی تصویر دیکھتی ہے۔ لاکھوں بار لاکھوں ہاتھوں سے اٹھا کر لاکھ آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اور اُسے ابکائی نہیں آتی۔ خوف نہیں معلوم ہوتا۔ نہ صرف یہ بلکہ متحیر رہ جاتی ہے۔ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے میری آنکھوں کی پرکھ گم ہوگئی ہے۔ یا دنیا اندھی ہوگئی ہے۔ دنیا کبھی اندھی نہیں ہوتی۔ دنیا ہمیشہ بینا ہوتی ہے۔ وہ دلوں کو پڑھ لیتی ہے اور دماغوں کو دیکھ لیتی ہے۔ دنیا سچ کہتی

ہے۔ سچ دیکھتی ہے۔ سچ سنتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دنیا ہے۔ کلّا کو اگر دنیا تعریف کے قابل سمجھتی ہے تو وہ تعریف کے قابل ہے۔ یقیناً ہے۔

یہ کس کے قدموں کی مدھم، مانوس چاپ کی برگزیدہ روشنی ہے جس نے مبرص دیواروں پر ٹنگی ہوئی سیاہی کو اتار کر پھینک دیا ہے۔ اور سارے کمرے میں پھیلی ہوئی خوشبودار شمعوں کی ٹھنڈی جگمگاہٹ نے دل کی کالی سلگتی ویرانی کو دھو دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کس کے ہونٹوں سے برستے ہوئے ستھرے حروف ہیں جن کے بطن سے یادگار، اور دلگداز انجمنوں کے میلے پھوٹ پڑے ہیں۔ اور سنسان دل کے ایک ایک کوچے میں چاندی کے چراغ جل اٹھے ہیں۔ سونے کے گھنگھرو بج اٹھے ہیں جن کی روشنی میں اور جن کی نغمگی سے کہانیوں کے شہزادوں کی طرح صدیوں سے سوئے ہوئے خیالوں کے نٹ کھٹ بالک آنکھیں ملتے اٹھ بیٹھے ہیں۔ اور تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں کود رہے ہیں۔ جشن منا رہے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ سب کچھ کیا ہے؟

(ہم کیا ہیں؟

ہم کٹھ پتلیوں کی طرح تماشہ دکھانے والے کے ہاتھوں میں جکڑے ہوئے ہیں! ۔ ۔ ۔ ۔ ہم دوسروں کے اترے ہوئے بے ڈھنگے کپڑے اپنے جسم پر لگا لیتے ہیں اور پھر ان کی تراش کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسروں کے دماغوں کے تھوکے ہوئے خیالات ہم اپنے خالی ڈبوں پر مڑھ لیتے ہیں اور ان کی بے سُری مکروہ نداؤں پر ملکوتی گیتوں کا "سہواً" دھوکا کھاتے ہیں اور اپنا سب کچھ فراموش کر ڈالنے کی مجرمانہ اداکاری کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر طرف چند حرفوں کی صلیب کھڑی ہے۔ جس پر ہم اپنی ہی کوکھ سے پیدا کئے ہوئے اُن خیالوں کو لٹکا دیتے ہیں۔ جن سے ہم تھک چکے ہیں۔ عاجز ہو چکے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ۔ ۔ ۔ ۔ جن کے پاؤں پاتال کی گہرائیوں کے کلیجے میں دھنسے ہوئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جن کے ہاتھ آسمانوں کی رفعتوں کو چھید کر نکل گئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

ہم جن کی آنکھوں کی جستجو کے سامنے چاند نے ہزاروں برس کے بوڑھے راز نکال کر رکھ دئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چند حرفوں کی خیالی صلیب کے سامنے اپنے ہاتھوں سے اپنا آپ باندھے انتظار کر رہے ہیں کہ کوئی رحمدل جلّاد آئے اور اپنے نرم مہربان ہاتھوں سے یہ جھولتا ہوا مقدس پھندا ہماری گنہگار گردنوں میں ڈال دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔)

(غیر مطبوعہ)

ہرچرن چاولہ

ڈھور

گوبندا آج میرے سامنے اُسی روپ میں تھا۔ جس میں آج سے بیس سال پہلے میں نے اُسے دیکھا تھا۔ جھکی جھکی آنکھیں۔ منہ کے اندر گرتی ہوئی مونچھیں۔ جھکے ہوئے کندھے اور مرجھایا ہوا چہرہ۔ فرق تھا صرف اتنا کہ اُس وقت گوبندا اکیس سال کا نوجوان گبرو تھا۔ مگر اب وہ اکتالیس سال کی ڈھلتی عمر میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے گوبندا کی زندگی کے ان درمیانی بیس سالوں کو ایک طوفانی دریا کی صورت میں دیکھا تھا۔ اسکی اکیس سال کی عمر اور اب اکتالیس سال کی عمر جیسے اسکی طوفانی زندگی کے دو پُرسکون کنارے تھے۔ ان دو کناروں کے بیچ میں اسکی زندگی کا دریا بہت ہی تیز بہتا رہا تھا مگر اب وہ زندگی کے اس کنارے پر کھڑا اُتنا ہی صلح کل اور تابعدار نظر آرہا تھا جتنا وہ پچھلے کنارے پر نظر آیا تھا۔ یہ نئی لہر کب اس کی زندگی میں آئی جس نے اُسے منجدھار سے کنارے پہنچا دیا۔ یہ جاننے کے لیے میرا بے چین ہونا قدرتی امر تھا۔ میں نے اسٹیشن کی طرف بڑھتے ہوئے گوبندا سے پوچھا۔

"گوبندا۔ کیا بات ہے؟ آج تم چُپ چُپ کیوں ہو۔؟؟"

ایک لمحہ کے لیے اُس نے اُداس آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولا "کچھ نہیں بڑے بابو جی۔ ذرا صاحب سے ملنے جا رہا ہوں"

بے شک گوبندا مجھے کچھ نہیں بتا سکا۔ مگر اس کی آنکھیں اسکے دل کی بات کہہ گئیں۔ میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ ایک تیز کٹار بھی تھا۔ دوسرے اس کا تمام راز خود بخود تھوڑی دیر بعد میرے سامنے کھلنے والا تھا۔ کیونکہ میں بھی صاحب سے ملنے جا رہا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے تین سال بعد بھی ابھی تک میری کئی رقوم محکمہ کے ذمہ باقی تھیں۔ جن کے متعلق مجھے صاحب سے شکایت کرنی تھی۔ گاڑی چلنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ ان ہی پانچ منٹوں میں میں نے اور گوبندا نے اپنا اپنا رونا رو دیا تھا۔

جوں ہی میں پلیٹ فارم پہ پہنچا۔ صاحب کو اپنی او سی (آفیسرز کوچ) میں بند پایا۔ میں نے چپراسی کے ہاتھ صاحب کے پاس اپنی چٹ اندر بھجوائی۔ صاحب نے مجھے جلدی ہی اندر بلوا لیا۔ گوبندا باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ شاید وہ صاحب سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ جب گاڑی نے وسل لی اور میں نہیں اترا تو وہ بھی لپک کر او سی میں آ گیا۔ میں نے اگلے سٹیشن تک صاحب سے بات کرتے ہوئے جانا تھا اور وہاں سے واپس بس میں آنا تھا۔ شاید یہی پروگرام بنا کر گوبندا بھی اندر آ گیا۔ جب میں اپنی کہہ چکا تو گوبندا بولا۔

"صاحب بہادر۔ ایک عرض میری بھی ہے"

"ہاں ہاں کہو گوبندا۔ کیا بات ہے؟" صاحب نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

پہلے گوبندا نے میری طرف دیکھا۔ ایک منٹ کے لیے اس نے نظریں اٹھائیں، جھپکائیں اور پھر جھکا کر رک رک کر کہنے لگا۔

"صاحب! میں تبدیلی چاہتا ہوں"

"تبدیلی" مجھے چھ حروف کا یہ لفظ ایسے لگا۔ جیسے گوبندا نے تبدیلی نہیں کہا، سجی سجائی خوبصورت او سی میں بم پھینک دیا ہے۔

میں نے حیران دشت زدہ ڈویژنل آفیسر کی موجودگی سے بے خبر ہو کر پوچھا۔

"گوبندا۔ کیا کہا؟ تبدیلی؟؟"

صاحب نے بھی حیران ہو کر دہرایا "تبدیلی؟ کیا بات ہے گوبندا؟؟"

گوبندا تھوڑی دیر چپ رہا جیسے اب رو دے گا۔ پھر فرش پر دیکھتے ہوئے بولا "صاحب مجھے بدل دیجئے۔ کہیں بھی۔ کسی بھی جگہ۔ جہاں آپ کا جی چاہے"

اس سے آگے گوبندا نے صاحب سے کیا کہا۔ صاحب نے کیا جواب دیا۔ میں کچھ بھی نہیں

سُن سکا۔ میرے دماغ کے پردہ پر گوبندا کی زندگی کے بیچ کے طوفانی ماہ و سال ایک فلم کی طرح آنے لگے۔ کب اگلا اسٹیشن آیا۔ کب میں اُترا۔ کب گھر پہنچا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ بس میرے سامنے گوبندا ہی گوبندا تھا۔ اکیس سے اکتالیس سال کا گوبندا۔

آج سے پورے بیس سال پہلے جب میں اس اسٹیشن پر بطور اسٹیشن ماسٹر کام کر رہا تھا گوبندا میرے پاس پانی والا ہو کر آیا تھا۔ جھکی جھکی آنکھیں، منہ کے اندر گرتی ہوئی مونچھیں، جھکے ہوئے کندھے اور گھبرایا ہوا چہرہ۔ اُس نے بڑے دفتر کا تعیناتی خط میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"بڑے بابو جی، میں آپکا بچہ ہوں، جو سیوا کہو گے، دل و جان سے کروں گا"

اور واقعی اس نے میری سیوا دل و جان سے کی تھی۔ ویسے بھی اسٹیشن ماسٹر اُن دنوں اسٹیشن کی دنیا کا خدا سمجھا جاتا تھا۔ گوبندا کے علاوہ بھی میرے ماتحت کافی عملہ تھا۔ کانٹے والے ٹکٹ لگانے والے، جمعدار، شنٹر، خلاصی، پانی والے اور بابوؤں میں تار بابو، بکنگ بابو، مال بابو اور گارڈی بابو۔ بابوؤں کے علاوہ نیچے والے عملہ میں سے ہر ایک کو باری باری میرے گھر کام کرنا پڑتا تھا یعنی بھینس کو چارہ ڈالنا، کٹی کرنا، آٹا پسوا لانا، کوئلہ پہنچانا، لکڑیاں چیرنا اور میری بیوی کے دوسرے گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹانا۔ یہ سب کام وہ لوگ اس لیے کرتے تھے، کیونکہ ان کا سیاہ و سفید سب کچھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ جسے چاہوں رکھوں، جسے چاہوں کھڑے کھڑے نکال باہر کروں۔ میری خدمت میں ان کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ مفت کی وردی، مفت کا تیل میرے گھر کی روٹی، کوارٹر کا آرام اور وقت بوقت چھٹی یا تنخواہ۔ اور میرے حکم سے ذرا اِدھر جانے میں اِن تمام سہولیات سے محرومی اور بعض اوقات نوکری سے بھی جواب۔ پھر بھلا کوئی کیوں میرے آگے دم مارتا۔ گوبندا میرے گھر کے سب کام کرتا تھا ویسے گوبندا عادتاً کافی شریف اور فرمانبردار انسان تھا مگر ایک دن اچانک میں نے اس کی زندگی میں عجیب و غریب موڑ دیکھا۔ میرے گھر میں کچھ دوستوں کی دعوت تھی۔ گوبندا میری بیوی کے ساتھ گھر کا تمام کام سنبھال رہا تھا۔ میز پر شراب کی بوتل کھُلی ہوئی تھی۔ گوبندا رات کے گیارہ بجے تک ہماری خدمت کرتا رہا۔ اُس کا ہاتھ بٹانے کے لیے ایک پانی والا بھی اسٹیشن سے منگوا لیا گیا تھا۔ جب سب چلے گئے۔ تو میں نے گوبندا سے کہا "گوبندا۔ برتن سمیٹ لے"

گوبندا وہیں کھڑا رہا۔ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ میں نے غصے بھرے لہجے میں کہا "ارے سُنا نہیں۔ برتن اٹھا لے"

"بابوجی۔ برہمن ہو کر گوشت والے برتن میں نہیں اٹھاؤں گا۔"

یہ گوبندا کی پہلی حکم عدولی تھی۔ میں غصے سے کانپنے لگا۔ میں گالیاں بکتا ہوا اٹھا اور ایک تھپڑ اس کے منہ پر جمانا ہی چاہتا تھا کہ وہ بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ ٹیبل لیمپ پر جا لگا جو نیچے گر کر چکنا چور ہو گیا۔ میرا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ اور میں پھر اس کی طرف بڑھا اور چلایا۔

"بھوتنی کے، تیری یہ مجال۔ میری حکم عدولی کرتا ہے۔"

میرا یہ وار بھی خالی گیا۔ کیونکہ وہ باہر جا چکا تھا اور میں شراب کے نشے میں دھت چارپائی پر جا گرا۔

دوسرے دن صبح جب میں دفتر پہنچا تو میرے دفتر کے باہر گوبندا بتیاں صاف کر رہا تھا۔ رات کا تمام واقعہ میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ میں نے گرج کر کہا۔ "نکل جا یہاں سے۔"

وہ بتیاں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گیا نہیں۔ اسے کھڑے دیکھ کر میرا پارہ اور چڑھ گیا۔

"الو کے پٹھے، حرامزادے، جاتا ہے کہ نہیں۔"

"گالیاں مت دو، بڑے بابوجی۔ میں چلا جاؤں گا۔"

"ابے جا بھی۔ حرام خور کے بچے، کمینے، میرا منہ کیا دیکھتا ہے۔ ورنہ دھکے دے کر باہر نکال دوں گا۔"

گالیاں سن کر وہ جاتے جاتے رک گیا۔ الفاظ کو غصے تلے دبا کر وہ بولا۔ "بابوجی، گالیاں مت دو۔" اس سے پہلے کہ وہ آگے کچھ کہے، میں نے تڑاخ سے ایک تھپڑ اس کے گالوں پر جڑ دیا۔ مگر دوسرے لمحہ وہ میری ٹانگوں میں گھس چکا تھا اور میں اس کے کندھے پر اٹھ کر میز پر پٹکا جا چکا تھا۔ دواتیں دور لڑھک گئیں تھیں۔ کاغذات اتھل پتھل ہو گئے تھے۔ ٹوپی دور جا گری تھی۔ میرا تمام غصہ اسپرٹ کی طرح اڑ گیا تھا۔ دوسرے لمحہ میں پاؤں پر کھڑا ہانپ رہا تھا۔ سامنے گوبندا کھڑا تھا جس کی چھاتی مجھے پہلے سے دوگنی چوڑی نظر آ رہی تھی۔ مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح اٹھی معلوم ہو رہی تھیں۔ شرمیلی اور جھکی رہنے والی آنکھوں میں انگارے بھرے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ٹوپی اٹھائی، کپڑے جھاڑے۔ دواتوں کو قلم دان میں جمایا۔ کاغذات کو ٹھیک کیا اور سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گم کرسی پر بیٹھ گیا۔ گوبندا باہر جا کھڑا ہوا۔ دفتر میں اس وقت صرف میں اور گوبندا تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ مجھے اس طرح مار کھاتے کسی اور نے نہیں دیکھا ورنہ تمام عزت مٹی میں مل جاتی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گوبندا کو اندر بلایا اور پھر کچھ دیر بعد میرا اس سے سمجھوتہ ہو گیا یعنی کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب وہ یہ سب باتیں اوروں کو نہ

بتلائے۔ اسی میں میری اور اس کی بھلائی تھی۔ مگر بعد میں یہ سمجھوتا اُس کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوا کیونکہ دوسرے دن وہ ایک بدلا ہوا انسان بن چکا تھا۔ اس کی گری ہوئی مونچھیں اب مروڑی اور چیڑی جانے لگی تھیں جھکی جھکی رہنے والی آنکھیں اب آنکھوں میں گڑ کر بات کرتی تھیں۔ اس نے میرے گھر یہ کام کرنا بند کر دیا تھا۔ میں اپنی عزت کی خاطر اب اسے دبانے یا اس سے کام لینے سے معذور تھا۔ مگر میری کمزوری نے اسے شہ زور بنا دیا۔ ایک دن اس نے باہر کے سینما کے بدمعاش کو بھی پیٹ دیا۔ وہ بدمعاش اس سینما کے بدمعاشوں کا سردار تھا۔ جب گوبندا نے لائن کے ادھر ٹکٹ لینے کی کوشش کی تو ان میں جھڑپ ہو گئی۔ بدمعاش بااصول غنڈہ تھا۔ اس نے گوبندا سے لڑتے ہوئے اپنے دوسرے بدمعاشوں کو منع کر دیا کہ وہ اس کی مدد کو ہرگز نہ آئیں۔ وہ خود ہی اس سے نپٹ لے گا مگر جب وہ گوبندا سے بھرے بازار میں پٹ گیا تو اس نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ اب باقی غنڈوں کا سردار گوبندا تھا۔ سینما کی ٹکٹوں کی بلیک کا سارا روپیہ پہلے گوبندا کی ہتھیلی پر آتا اور پھر تقسیم ہوتا تھا۔ اس سے گوبندا کو جہاں آمدنی بھی ہونے لگی وہاں اُس کی علاقے اور مضافات میں بھی دھاک بندھ گئی۔ ایک دن ایک بہت ہی اچھی پکچر کے جب ریلوے کے ٹریفک انسپکٹر کو ٹکٹ نہیں مل رہے تھے جسے دیکھنے کے لئے وہ خاص طور سے اپنے ہیڈ کوارٹر سے بال بچوں سمیت آیا تھا۔ گوبندا نے اسے ٹکٹوں کی بجائے فری پاس لا دیئے۔ اس کے بعد جب بھی کوئی افسر۔ انچارج یا انسپکٹر وغیرہ کسی نئی فلم کا پہلے دن ٹکٹ لینا چاہتا اور اسے کسی قسم کی تنگی محسوس ہوتی تو یہ تکلیف گوبندا فوراً دور کر دیتا۔ دوسرے کاموں میں گوبندا جہاں بھی ہاتھ ڈالتا کامیابی اس کے قدم چومتی۔ شہر کے دوسرے بدمعاش بھی کئی دوسری لائنوں میں اس کی کئی مشکلیں آسان کر دیتے۔ ایک ڈویژنل افسر کو اس نے اس کی پرانی ماڈل کی موٹر کا پرزہ جانے کہاں سے لا دیا تھا جو کہ موٹر مارکیٹ میں ایک عرصہ سے نایاب تھا جس کی وجہ سے صاحب کی موٹر ایک عرصہ سے خراب پڑی تھی۔ ہوتے ہوتے گوبندا دوسرے بڑے افسروں کا منظورِ نظر بن گیا۔ ایک دفعہ ایک افسر جو ذرا زیادہ سخت قسم کا واقع ہوا تھا اور جس نے گوبندا کو یہاں سے تبدیل کرنا چاہا تو دوسرے ہی دن گوبندا نے کچھ بدمعاش اس کے پیچھے لگا دیئے جنہوں نے موقعہ پاتے ہی اسے اکیلے میں گھیر کر ننگے چاقوؤں کے وہ جھٹکے دیئے کہ دوسرے ہی دن اس نے گوبندا کی تبدیلی کے احکامات روک دیئے۔ افسروں کی مدد فرمانبرداری۔ اطاعت گذاری اور اچھے کام نے بھی اس کی جگہ افسروں کے دل میں بنا دی۔ اور ترقی کرتے کرتے وہ پانی والا سے شنٹر بن گیا۔ اپنے محکمہ ٹریفک کے علاوہ بھی وہ دوسری برانچوں میں مقبول ہو گیا۔ وہ ساتھیوں۔ دوستوں اور افسروں کی بروقت مدد سے فائدہ اٹھاتا اور اگر یہ باتیں کہیں فیل ہو جاتیں

تو پھر ڈنڈے سے اپنا الو سیدھا کر لیتا۔ اس لئے حکام بھی اس سے کنی کاٹنے لگے تھے۔

گوبندا میرے کام میں ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ نیچے والے تمام سٹاف کی حاضری لگوانا، انھیں چھٹی دینا، اُن کی بیماری اور دکھ سکھ کے وقت کام کا دیکھنا میرے لئے ایک بہت بڑی مدد تھی۔ اس لئے ریلیف کا تمام کام میں نے خود ہی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ میرے گھر کے کام کے لئے وہ بڑی باقاعدگی سے سٹاف کی باری باری ڈیوٹی لگاتا اور مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہ دیتا تھا۔ پاؤں پھیلاتے ہوئے اُس نے گارڈ رننگ روم کے ایک پُرانے غسل خانہ میں جو ایک عرصہ سے استعمال میں نہیں آ رہا تھا جوئے کی چوکڑی جمانی شروع کر دی۔ مجھے بُرا تو بہت لگا مگر جب گارڈوں کی طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تو میں نے چپ رہنا ٹھیک سمجھا۔ مگر جب ایک دن گوبندا اور میں دفتر میں بیٹھے تھے۔ تو ایک نیا گارڈ شکایت لے کر آیا کہ وہاں کچھ بدمعاش جوا کھیل رہے تھے۔ جب اس نے انھیں ٹوکا تو ان میں سے ایک نے اسے گالی دی اور مارنا بھی چاہا مگر وہ وہاں سے کھسک آیا ورنہ وہ غنڈے اس کا کچومر نکال دیتے۔ میری بجائے گوبندا بولا "بابوجی۔ وہ لوگ بدمعاش ہیں۔ آپ جیسے شریف آدمی کو ان سے الجھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ انھیں ٹوکا نہ کیجئے"

گارڈ بولا "بدمعاش ہیں تو ہوتے رہیں۔ پولیس مر تو نہیں گئی"

گوبندا نے سمجھاتے ہوئے کہا "بابوجی۔ پولیس تو زندہ ہے مگر اسے باقاعدہ حصہ ملتا ہے وہ آپکا ساتھ کیوں دینے لگی"

"نہ دے، مگر پھر بھی ان کو شریف آدمیوں کی پگڑی یوں نہیں اچھالنی چاہیئے" گارڈ جیسے لاجواب ہو کر بولا۔

"تمھارے بچے جیتے رہیں۔ یہ کہی نا تم نے کام کی بات" گوبندا نے جیرنجی کانٹے والے کو بلایا اور کہا "او جیرنجی۔ بھیجے سے جا کر کہو۔ تمھیں گوبندا بلاتا ہے"

تھوڑی دیر بعد وہی بدمعاش دفتر میں گوبندا کے سامنے کھڑا تھا۔ سب کے سامنے گوبندا نے اس کی طبیعت صاف کر دی۔ اس نے سب کے سامنے گارڈ سے معافی مانگی۔ اس واقعہ کے ساتھ لوگ اور زیادہ گوبندا کی عزت کرنے لگے۔ اور وہ اور زیادہ کھل کر کھیلنے لگا۔ اس نے کہہ سن کر بابوؤں کا کوارٹر اپنے نام الاٹ کروا لیا۔ محکمہ بجلی سے بجلی لگوائی گئی۔ انجینئرنگ والوں نے پانی کا نل لگا دیا۔ ٹریفک سٹاف میں سے ایک آدمی میرے گھر کے ساتھ ساتھ اس کے گھر پہ بھی کام کرنے لگا۔

اپنی ڈیوٹی ٹھوک بجا کر دینے کے بعد گوبندا سینما کے ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹ کرتا۔ رننگ روم

میں جوا کھلواتا۔ یارڈ میں مسافروں سے گاڑی میں جگہ دلوانے کے دام وصول کرتا! پارسل والوں سے اپنا حصّہ اینٹھتا اور رات رات بھر گھر سے غائب رہتا۔ اس کی بیوی اس سے جھگڑتی کہ وہ رات کو گھر سے باہر نہ رہا کرے۔ وہ کوشش بھی کرتا کہ اس کی بیوی کو شکایت کا موقعہ نہ ملے۔ مگر وہ پھر بھی کبھی کبھی لیٹ ہو ہی جاتا۔ جس سے اس کی بیوی اسے شکوک بھری نظروں سے دیکھتی۔ وہ کہتا۔

"بھلی لوگ۔ مجھ میں ہزار برائیاں سہی مگر میں بدچلن نہیں ہوں۔ بس یہی ایک گن ہے مجھ میں۔"

مگر اس کی بیوی کے دماغ سے شک کی پرچھائیں دھندلی نہ پڑتی اور وہ اکثر اسے کچوکے لگاتی رہتی۔ اپنی بیوی کی شکی طبیعت سے چڑ کر کبھی کبھی وہ رات رات بھر غائب بھی ہو جاتا یا بازار حسن میں گانے وغیرہ کی محفل میں جا بیٹھتا مگر پھر بھی اپنی بیوی کی امانت میں خیانت کرنے کا خیال اسے کبھی نہ آتا۔ مگر اس کی شکی مزاج بیوی اور زیادہ وہمی ہوتی گئی۔ وہ لڑتی جھگڑتی مار کھاتی مگر ٹوکنے سے باز نہ آتی۔ چونکہ گوبندا کو راہ راست پر لانے کا طریقہ غلط تھا۔ اس لئے مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ گوبندا اڑیل ٹٹو بن گیا اور اس کی بیوی اور زیادہ شکی مزاج ہوتی گئی۔ آخر ایک دن وہ روٹھ کر میکے چلی گئی۔ گوبندا نے اسے ایک ہفتے بعد خط لکھا کہ فوراً واپس چلی آؤ ورنہ زندگی بھر پچھتاؤ گی۔ مگر جب ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا تو گوبندا نے ایک مہینے بعد خط لکھ بھیجا۔ اب تمہارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری جگہ اب کسی اور کو دے دی گئی ہے ساتھ میں گوبندا نے کسی عورت کی تصویر بھی بھیج دی مگر جب اس کی یہ چال بھی ناکام رہی اور ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا تو دو ماہ کے انتظار کے بعد وہ واقعی کسی عورت کو گھر لے آیا۔ اس کے بعد تو بس دونوں طرف سے تعلقات ہی جیسے کٹ گئے۔ کوئی آٹھ مہینے بعد گوبندا کو پہلی بیوی سے تار موصول ہوا کہ اس کے ہاں ایک لڑکی نے جنم لیا ہے تو وہ کچھ دیر کیلئے ڈگمگایا پھر دوسری بیوی کا منہ دیکھ کر تمام بات پی گیا۔ اس کے بعد ادھر سے بھی خاموشی ہو گئی۔

وقت گذرتا گیا۔ مہینے سال بنتے گئے۔ گوبندا مونچھیں اکڑائے چھاتی پھلائے زمانے کے سینے پر دندناتا پھرتا رہا۔ ایک دن اچانک کئی سالوں بعد اسے اپنی ساس کا ایک خط ملا کہ وہ آ کر اپنی امانت اپنی بیٹی کو سنبھال لے۔ کیونکہ اس کی ساس اب زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی اور اب اس کی لڑکی کا اور کوئی سہارا نہیں تھا جہاں وہ اپنی باقی زندگی رہ سکے یا شادی کر سکے جب اس خط کا بھی گوبندا کی طرف سے کوئی جواب نہیں گیا۔ تو کچھ دن بعد اس کی لڑکی خود اس کے پاس آ گئی کیونکہ اس کی نانی اب اس جہاں سے رخصت ہو چلی گئی تھی۔ آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ خون نے جوش مارا۔ لڑکی باپ کے پاس رہنے لگی کبھی کبھی چودہ پندرہ سالہ شانتی اور اس کی سوتیلی ماں میں ٹھن جاتی۔ بات

گوبندا تک پہنچتی تو وہ ایک ایماندار مصنف کی طرح دونوں کی باتیں بڑے غور سے سنتا اور تقریباً ہر دفعہ بیوی کو قصور وار پاکر اس کی مرمت بھی کرتا۔ آخر وہ بھی تین سال تک پٹنے کے بعد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اب گھر میں گوبندا اور اس کی بیٹی شانتی رہنے لگے۔ میں اسی دوران ریٹائیر ہوکر دریا پار کی ایک کالونی میں بس گیا۔ اس لئے مجھے گوبندا کی اگلی زندگی کا کچھ بھی علم نہیں ہو سکا۔

آج میں نے جب گوبندا کی زندگی میں یہ نیا موڑ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ گوبندا جو کسی بھی حالت میں یہ شہر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جہاں اس کی عزت تھی۔ رعب تھا۔ دبدبہ تھا۔ تنخواہ کے ساتھ شہری الاؤنس کے علاوہ سینکڑوں روپے کی بالائی آمدنی تھی اب اچانک کیوں تبدیل ہونے پہ تیار ہو گیا۔ یہ جاننے کے لئے میری بے چینی قدرتی تھی۔ دوسرے دن جب رام سنگھ جمعدار نے مجھے بتایا کہ گوبندا کی نوجوان لڑکی اس کے ہی بدمعاش دوست بھجے سے پریم کی پینگیں بڑھا رہی ہے تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ گوبندا ایک لڑکی کا باپ ہے، اور لڑکی کا باپ چاہے بادشاہ ہی کیوں نہ ہو اسے کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جھکتا ہے مگر جگہ دیکھ کر۔ اسی مناسب جگہ کے لئے گوبندا یہ شہر چھوڑ رہا ہے دھن دولت اور عزت چھوڑ رہا ہے۔ وہ جواری سہی، بدمعاشوں کا سردار سہی، سینما کی ٹکٹوں کا بلیک مار کٹیا سہی مگر ان سب باتوں سے اوپر کچھ اور بھی ہے۔ وہ ایک نوجوان لڑکی کا باپ ہے۔ بس یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ یہی اس کی مونچھوں کو نیچا کرنے والی بات ہے۔ یہی اس کا جھکاؤ ہے۔ یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا موڑ ہے۔

انور عنایت اللہ

سلامت محل

شروع کرتا ہوں میں نام سے خداوند تعالیٰ کے جو پرورش کرنے والا ہر خاص و عام کا ہے۔ اُس کی قدرت کا کیا ٹھکانہ جس نے سخن کو زبان پر پیدا کیا۔ بقول شاعر؎

بنام جہاندارِ جاں آفریں
حکیم سخن بر زباں آفریں

یہ بندۂ ناچیز سلامت محل کا پروردہ ہے۔ سلامت محل کے مکینوں کی داستان غریب و سادہ و رنگین ہے۔ یعنی یہ کہ اس میں غربت کم ہے، رنگینی زیادہ ہے اور بہ حکم جناب حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے، مالک سلامت محل، یہ مختصر سوانح عمری قلم بند کی جا رہی ہے۔ آج جمعہ ہے اور جون کا مہینہ اور سال ہے ۱۹۵۲ عیسوی۔

نوشیروان روڈ پر جو سرخ، طویل، خاموش بظاہر پُروقار کوٹھی ہے، قیام پاکستان سے پیشتر اس کا نام نہ جانے کیا تھا۔ اب تو وہ سلامت محل کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے نے اسے ایک دہشت زدہ سندھی سے کوڑیوں کے مول خریدا اور پھر اپنی دوسری بیگم، رخشندہ سلامت بانو کو اس کی نام رکھائی کے سلسلے میں شرفِ ملاقات در تخلیہ بخشا۔ وہ اپنی اس سابق چہیتی بیگم کو اکثر صرف رسمی شرفِ ملاقات بخشا کرتے۔ پچھلے چار برس سے یہ رسمی ملاقات حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرتی تھی۔ اسی لئے ان کے درجن بھر بچوں میں سب سے چھوٹے کی عمر ساڑھے تین سال تھی۔ سادہ لوح بیوی کو تخلیہ میں بلوایا گیا تو بیچاری کی سمجھ میں نہ آیا کہ آج یکایک حاجی میاں صاحب اس قدر مہرباں کیوں ہو گئے۔ بیگم نے جلدی سے کپڑے بدلے، بناؤ سنگھار کیا اور اپنے غرارے کے پائنچے سنبھالتی ہوئی تیزی سے شوہر کے اجلاس میں پہنچیں۔ حاجی میاں صاحب بہ حسب معمول اپنی بڑی سی توند سہلاتے گاؤ تکیوں کے سہارے مسند پر براجمان

تھے۔ وہ اپنی مختصر سی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور خلاف معمول مسکرا بھی رہے تھے۔ ان کے سیاہ فام چہرے سے خوشی اور آسودگی نمایاں تھی۔ آج میاں خوش تھے تو بیگم بھی فوراً خوش ہو گئیں۔ ایک طرف بیٹھتے ہوئے انھوں نے پیار بھری شکایت کی " آپ نے بہت دلوں کے بعد یاد کیا۔ سنا ہے دشمنوں کے انگوٹھے پر چوٹ آ گئی تھی۔ اب کیسا ہے انگوٹھا؟ "

" انگوٹھے کو مارو گولی صدّو کی ماں ـــــ آج ہم بہت خوش ہیں۔ ہم نے آخر یہ کوٹھی خرید ہی لی۔ آج اس کی رجسٹریشن ہو گئی ہے۔ خدا کی قسم، کل رات استخارہ کیا تھا۔ نکلا دوسری بیوی سے تعلقات بڑھاؤ۔ مبارک ثابت ہوں گے۔ ویسے مجھے اس عمر میں بچے کی خواہش نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں تعلقات بڑھانا چاہتا ہوں ـــــ اب یہ بتاؤ صدّو کی ماں ـــــ کیا نام رکھیں اس نئی کوٹھی کا؟ مجھے تو فتح محل پسند ہے۔ لیکن پڑوس میں ایک کمبخت کبابیئے نے اپنی دوکان کو فتح محل نام دے رکھا ہے۔ بدمعاش کہیں کا۔ جی چاہتا ہے اس کی دوکان لٹوا دوں ـــــ خیر انشاء اللہ یہ بھی ہو گا، ذرا قدم جم جائیں اپنے! "

بیگم بڑی فرمانبرداری سے حاجی میاں صاحب کا منہ تک رہی تھیں۔ ایسے موقعوں پر وہ صرف منہ تکا کرتیں کیونکہ بھلا مجازی خدا کے سامنے کہیں کنیز بول بھی سکتی ہے۔ وہ تو شوہر کے پیر کی جوتی ہے۔ اسے ہر حالت میں جوتی ہی رہنا چاہیئے۔ حاجی میاں صاحب نے بیگم کو خاموش گوش بر آواز دیکھا تو بڑے پیار سے اُن کے بھرے بھرے گال پر چٹکی لی اور اپنے مصنوعی دانت درست کرتے ہوئے بولے۔

" خدا کی قسم۔ ہم اس کا نام سلامت محل کیوں نہ رکھیں؟ شاہجہاں نے تاج محل بنا کر اپنی بیوی کو زندہ جاوید کر دیا۔ ہم بھی تمھیں زندہ جاوید کر دیں گے صدّو کی ماں! "

صدّو کی ماں نے شوہر سے زیادہ تاریخ پڑھ رکھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شاہجہاں کا تاج محل اس کی چہیتی بیگم کا مقبرہ تھا۔ حاجی میاں صاحب اپنی چہیتی بیگم کے لئے اس کی زندگی ہی میں اس کا مقبرہ بنا رہے تھے۔ زندہ درگور تو وہ تھی ہی۔ اب صرف مقبرے کی کسر تھی سو حاجی میاں صاحب وہ بھی پوری کرنے کی ٹھان رہے تھے۔ وہ خاموش بیٹھی اپنا گال سہلاتی رہی اور مسکراتی رہی اور نئی کوٹھی کا نام " سلامت محل " رکھ دیا گیا اور در و دیوار کے علاوہ گوشہ و محراب پر بھی پاکستان کی مختلف زبانوں میں کوٹھی کا نام بڑے بڑے سنہرے حروف میں لکھوایا گیا تاکہ دور

دور سے نظر آ جائے۔

نہ جانے اس کوٹھی کا رنگ پہلے کیا تھا۔ کراچی میں یوں تو بارش ہوتی ہی نہیں تھی لیکن جب سے مہاجرین اس طرف آئے تھے اس شہر کی تو ہر چیز بدل گئی تھی۔ اب یہاں خوب بارش ہوتی تھی۔ ان بارشوں کی وجہ سے کوٹھی کا رنگ بالکل ہی چوپٹ ہو گیا تھا۔ نئے رنگ کے سلسلے میں ایک دن حاجی میاں صاحب نے اپنے منیم کے سر پر ایک دھول جمائی اور پھر اس سے مشورہ شروع کر دیا۔ یہ بوڑھا تجربہ کار بے ضرر منیم انھیں سستے داموں کراچی میں مل گیا تھا جس پر ترس کھا کر حاجی صاحب نے اسے اپنے در پر پڑا رہنے دیا تھا۔ یہ ان کی پرانی کوٹھی کے گیراج میں معہ اپنے دس بچوں اور ایک عدد بیوی کے رہتا تھا۔ ہر روز دوکان پہ پہنچ کر حاجی میاں صاحب اس بے ضرر کتے کی پیٹھ تھپکتے اور بڑی محبت سے اس کی چندیا پہ ایک دھول جما کر اسے ایک ادھ ننگی گالی دیتے۔ انھیں گالیاں دینے میں ایک خاص مہارت تھی۔ مثلاً وہ جب کبھی ماں کی گالی دیتے تو فوراً اس کی بہن اور بیٹی کے ساتھ ناشائستگی سے پیش آنے کی اپنی دیرینہ آرزو کا بھی ضرور اظہار کر دیتے۔ اسی طرح باپ اور بیٹے کی گالیاں دیتے ہوئے وہ بڑے شاعرانہ انداز میں بیوی اور ماں کی گالیاں بھی اس میں ملا دیتے۔ منیم، حاجی میاں صاحب کی گالیاں بڑی وفاداری سے سنتا رہتا اور ــــ "حضور کی بندہ پروری ہے"۔ کہتا رہتا۔

ایک دن حاجی صاحب نے حسب معمول گالیاں دیں اور کوٹھی کو نئے سرے سے رنگنے کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ اس پر منیم جی نے حسب عادت اپنے زرد زرد سے دانت نکالے اور کانوں پر عینک کی کمانیاں درست کیں اور غلامانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے رائے دی۔

"بندہ پرور ــــ ان دنوں ہر بات میں ترقی پسندی کا اظہار کرنا فیشن سا ہو گیا ہے۔ دیکھئے نا ــــ ہر میدان میں روس کی جیت ہو رہی ہے۔ اس لئے دنیا بھر میں سرخ رنگ بڑا ہر دلعزیز ہو رہا ہے۔ اس ناچیز کی رائے تو یہ ہے کہ حضور پر نور فیض گنجور کی کوٹھی سرخ ہونی چاہیئے۔"

حاجی میاں صاحب کو منیم جی کی یہ تجویز پسند آئی۔ انھوں نے اس کی چندیا پہ پیار سے ایک چپت لگائی اور محبت سے ماں کی گالی دی۔ اس کی بہن اور بیٹی کے ساتھ ناشائستگی سے پیش آنے کا عزم ظاہر فرمایا اور جیب سے ایک اٹھنی نکال کر منیم جی کو "بخشش" دی۔ اسی

شام کو سلامت محل نے سُرخ لبادہ اوڑھ لیا اور بڑے فخر سے حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے خود کو ترقی پسند شمار کرنے لگے۔

نئی کوٹھی کی سجاوٹ کی طرف سے مطمئن ہوکر حاجی میاں صاحب نے اس ذلیل کبابیے کا دھیان کیا۔ صبح شام اُٹھتے بیٹھتے انھیں "فتح محل —— کبابوں کی مشہور دوکان ——" کا سائن بورڈ بُری طرح کھٹکتا۔ یوں لگتا یہ ذلیل کبابیا اُن کا، اُن کی عظمت کا، اُن کے جاہ وحشم کا، اُن کی اس خوبصورت کوٹھی کا مُنہ چڑا رہا ہے۔ ایک دن صبر کا پیالہ لبریز ہوگیا۔ انھوں نے اسے بلوایا۔

محمد فتح کبابیے کی بھی کوئی معمولی شخصیت نہ تھی۔ وہ جنگ آزادی کا ایک بڑا سرگرم رکن تھا۔ ایک غیور سپاہی تھا۔ اس نے میرٹھ میں غیر ملکی حکومت کے خلاف ہڑتالیں کرائی تھیں۔ پولیس کے ڈنڈے کھائے تھے اور کئی بار جیل گیا تھا۔ اس کی قربانیوں کی تو ایک طویل داستان تھی۔ اس لیے جب حاجی میاں ابوالفتح نے اس پر اپنی امارت کی دھونس جماتے ہوئے رائے دی کہ وہ اپنی سائن بورڈ فوراً بدل دے ورنہ انھیں دوسری سخت تدابیر اختیار کرنی ہوں گی —— تو محمد فتح کو حاجی میاں صاحب کا تحقیر آمیز لہجہ بے حد بُرا لگا۔ اس نے اپنا سینہ پھُلا کر، اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دے کر صاف لفظوں میں حاجی صاحب کو جتادیا کہ وہ اپنی دوکان کا ایک مالک ہے۔ اس لیے اس کا جو جی چاہے گا وہ کرے گا۔ وہ ہوتے کون ہیں اُسے حکم دینے والے؟ —— وہ رئیس ہوں گے تو اپنے گھر کے —— وہ بھی اپنے گھر کا رئیس ہے !!!

یہ کہہ کر محمد فتح کبابیے نے مونچھوں پہ تاؤ دیا اور وہاں سے لوٹ آیا۔ حاجی میاں صاحب اس کی بدتمیزی پہ تلملا کر رہ گئے۔

ایک صبح شہر کے سارے اخباروں میں یہ خبر جلی حروف میں شائع ہوئی کہ حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے نے ملک کے کئی امدادی فنڈوں میں ایک لاکھ روپیہ چندہ دیا ہے۔ خود حاجی میاں صاحب کے دو اخبار تھے۔ ایک انگریزی اور ایک اردو۔ دونوں اخباروں نے اس عطیہ پر اداریئے لکھے اور حاجی میاں صاحب کو ملک وملت کا سب سے بڑا بہی خواہ گردانا۔ اسی شام کو خدا کا کرنا یہ ہوا کہ پولیس کے چند سپاہی حاجی میاں صاحب کے زر خرید غنڈوں کے ساتھ محمد فتح کبابیے کی دوکان پر پہنچے۔ سُرخ پگڑیوں کو دیکھ کر محمد فتح کی

سمجھ میں نہ آیا کہ ایسے امن پسند شہری کے گھر پر جس نے حصول آزادی کے لیے بے شمار قربانیاں دی تھیں، جن کی خدمات کا خود وزیر اعظم خواجہ صاحب کو بھی اعتراف تھا ــــ اس کے یہاں آخر سُرخ پگڑی والوں کا کیا کام تھا۔ پولیس نے آتے ہی اسے حکم دیا کہ یہ زمین حاجی میاں صاحب کے نام الاٹ ہو گئی ہے۔ یہاں وہ ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے شام تک اسے دوکان خالی کر دینی ہو گی۔ پولیس تو حکم سنا کر چلی گئی لیکن حاجی میاں صاحب نے نوکروں نے میدان خالی پا کر کبابیے محمد فتح کا سارا سامان سڑک پر پھینک دیا۔ کبابیے نے مداخلت کی کوشش کی تو اس کی خوب مرمت کی گئی اور حاجی میاں صاحب نے اپنا رسوخ استعمال کر کے اس پر امن خطرے میں ڈالنے کا الزام لگوایا اور جیل میں بند کروا دیا۔

آجکل کبابیے کی دوکان کی جگہ حاجی میاں صاحب کا شاندار کتا خانہ ہے جہاں ان کے درجن بھر اعلیٰ نسل کے کتے پلتے ہیں۔ سنا ہے تین ماہ تک جیل میں چکی پیسنے کے بعد بھی محمد فتح کبابیے کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ حاجی میاں صاحب کی سُرخ کوٹھی کا سُرخ پگڑی والوں سے کیا تعلق ہے؟ وہ پہروں سوچتا۔ ملک اور ملت کی خاطر قربانیاں پیش کرنے کا تصور اب کس قدر بدل گیا تھا؟ یہ لفظ بھی اب ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہو چکا تھا۔ جسے ہم کل تک قربانی کہتے تھے وہ آج حماقت کہلاتی تھی!

فتح محل پر قبضہ کر لینے کے بعد حاجی میاں صاحب نے عوام کی خدمت کی خاطر ایک درجن بسیں خریدیں اور شہر کے اہم رُوٹس پر انھیں شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا۔ جوتے والے "ٹرانسپورٹ" کی بسیں کافی ہر دلعزیز ثابت ہوئیں کیونکہ اس میں بیٹھنے والوں کیلئے ہر طرح کی آزادیاں حاصل تھیں۔ عموماً چالیس نشستوں کی بسوں میں اسّی مسافر سفر کیا کرتے۔ وقت کی اہمیت کا بھی ان کے ڈرائیوروں کو خوب اندازہ تھا۔ ایک گھنٹے کا راستہ اکثر آدھے گھنٹے میں طے ہو جاتا!

حاجی میاں صاحب اللہ کے نیک بندوں میں سے ہیں۔ خیرات کرتے ہی رہتے ہیں۔ رمضان میں باقاعدہ لنگر کا انتظام ہوتا ہے۔ سردیوں میں لحاف تقسیم ہوتے ہیں۔ کئی حج کر چکے ہیں۔ بلکہ حج کرنا تو گویا ہر سال کا معمول ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ حج ہی کی برکت ہے کہ ہر سال ان کی دولت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ اپنی متعدد بیویوں کو بھی ہمیشہ حج پر لے جاتے ہیں

اور جب وہ حج سے آتے ہیں تو ان کی بیویاں ---- اللہ کی شان ---- زیورات میں لدی پھندی آتی ہیں۔ شہر میں مسجدوں کی کمی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے خاص طور پر برادری کے لئے ایک خوبصورت مسجد اور کئی یتیم خانے بنوائے ہیں۔ مسجد کے در و دیوار اور میناروں پر ان کا نام جلی حروف سے لکھوایا گیا ہے ---- "مسجد ابو الفتح مخصوص برائے ممبران برادری"۔

کہتے ہیں حاجی میاں صاحب کو اپنا پورا نام لکھوانے کی ضد تھی تا کہ قیامت کے دن فرشتے اس مسجد کے خالق کو پہچاننے میں غلطی نہ کریں۔ لیکن مصاحبوں نے دبے لفظوں میں سمجھایا کہ ایک تو مسجد کا نام ویسے ہی طویل ہو گیا ہے۔ دوسرے اس میں فارسی تراکیب کسی حد تک کھٹکتی ہیں تیسرے یہ کہ مسجد کے در و دیوار پر "جوتے والے" لکھوانا کچھ عجیب سا لگے گا۔ آخری بات تو حاجی میاں صاحب کی سمجھ میں فوراً آ گئی لیکن پہلی دو باتوں پر انھوں نے مطلق دھیان نہیں دیا اور جھنجھلا کر کہا۔

"فارسی تراکیب کوئی ایران والوں کی گھر کی کھیتی ہیں؟ اس میں تبدیلیاں کرنے کا ہمیں بھی پورا حق ہے۔ آخر ہمارے یہاں بھی مرزا صاحبان اور نذر الاسلام کی قسم کے بہت سے شاعر پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ساری عمر فارسی میں شاعری کی اور نام پیدا کیا!" اس بلیغ اور فصیح تشریح کے بعد کس میں تاب تھی کہ زبان ہلاتا۔

فرسودہ خاندانی رسوم کے مٹانے میں بھی حاجی میاں صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ برادری میں شادی کی ایک نہایت فرسودہ رسم تھی۔ کہتے ہیں کہ شادی کے بعد دلہن صرف آدھی رات اپنے شوہر کے ساتھ گذارنے کے بعد میکے واپس آ جاتی اور اس وقت تک شوہر کے یہاں نہ جاتی جب تک سسرال سے بلاوا نہیں آ جاتا۔ اس رسم میں طرفین یہ ضرور خیال رکھتے کہ جتنی تاخیر سے بلوایا جاتا، خاندان کی ناک اتنی ہی اونچی ہوتی۔ اکثر دلہن مہینوں میکے میں پڑی رہتی۔ اس نصف سہاگ رات کے تصور ہی سے اندر ہی اندر تڑپا کرتی اور خاندان کی ناک روز بروز اونچی ہوتی جاتی۔ اسی لئے برادری میں چپٹی ناک عنقا ہے۔ لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُن کی اپنی لاڈلی بیٹی کی بھی شادی ہوئی۔ وہ بھی حسب معمول رات کے چند گھنٹے اپنے شوہر کے ساتھ گذار کر میکے لوٹ آئی۔ ہفتے گذر گئے لیکن سسرال والوں نے اپنی اونچی ناک کی حفاظت کرتے ہوئے دلہن کو واپس نہ بلوایا۔ ادھر حاجی میاں صاحب کو بھی اپنی اونچی ناک کا اتنا ہی خیال تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ دولہا دلہن ایک دوسرے کے قرب کیلئے اندر ہی اندر تڑپتے رہے اور اونچی ناک لٹھ لئے دروازے پر پہرہ دیتی رہی۔

ایک رات چیخ پکار سے حاجی میاں صاحب کی آنکھ کھُل گئی۔ گھبرا کر اٹھے تو خبر ملی کہ چور پکڑا گیا ہے ―― چور ان کی جوان لاڈلی کے کمرے کی دیوار پھاند کر بھاگ رہا تھا کہ وفادار چوکیدار نے اسے پکڑ لیا۔ حاجی میاں صاحب اُس بدمعاش کو مادر زاد ننگی گالیاں دیتے ہوئے اُس کی ماں بہن حتیٰ کہ بیوی تک سے طرح طرح کی خوش فعلیاں کرنے کا بانگ دہل اعلان کرتے ہوئے چیختے چنگھاڑتے، اپنی توند سنبھالتے وہاں پہنچے۔ جب چور کو روشنی میں لایا گیا تو دونوں کی سٹی گم۔ یہ انکشاف ہوا کہ یہ تو دولہا میاں ہیں جو ―― اُن کی لاڈلی کو یعنی اپنی نوبیاہتا بیوی کو سلام کرنے چلے آئے تھے!

اس سانحہ کے بعد لوگوں نے اکثر حاجی میاں صاحب کو اپنی فرسودہ رسموں کے خلاف گھنٹوں بڑی فصاحت اور بلاغت سے تقریریں کرتے سنا ہے۔

حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے نے امدادی فنڈوں میں چندے دے کر اپنی دنیا بنا لی ہے۔ عاقبت تو نمازیں پڑھ کر، متواتر کئی حج کر کے، اور مختلف شہروں میں "مساجد ابوالفتح مخصوص برائے ممبران برادری" ―― بنوا کر سنوار ہی لی تھی۔ اب وہ دنیا کے بکھیڑوں سے دور خاموش زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہر ہفتہ کی رات کو دوستوں کے اصرار پہ بلاناغہ ایک جھنجھناتی اور کھنکھناتی پارٹی ہو جاتی ہے تو اتوار کی صبح تک جاری رہتی ہے۔

اس بندہ ناچیز حقیر فقیر نے حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے کی مختصر سی سوانح عمری قلمبند کر لی ہے اور مجھے یقین ہے حاجی میاں صاحب بھی سلطان محمود غزنوی کی طرح میری اس جان توڑ محنت کا منہ مانگا صلہ ضرور دیں گے۔ صاف گوئی، حق گوئی، راست گوئی اور دیگر ساری "گوئیوں" کے معاملے میں یہ خاکسار بھی فردوسی سے کم نہیں ہے۔

یہ امداد ایزدی و توفیق تحمد بے نیاز، سوانح عمری حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے ختم ہوئی دعا کردگار سے یہ ہے کہ وہ ہم سب کو ان نفوسِ قدسیہ کی پیروی کی توفیق عطا کرے ؎

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد۔

تمت بالخیر:

مکرر: اس عظیم سوانح عمری کا عنوان "سلامت محل"، اس لئے ہے کہ سلامت محل ہی نے حاجی میاں ابوالفتح جوتے والے کو وہ بنایا جو وہ آجکل ہیں!!!

★

محافظ حیدر

زاویے

میگی کی نیند جب پوری ہو چکی تو اسے اپنا سارا بدن کمزور اور بے حس لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس نے آنکھیں کھولیں مگر دکھائی کچھ نہ دیا۔ اُس کی آنکھیں پانی اور جلن سے بھری تھیں۔ اس نے الٹے ہاتھ سے آنکھیں پونچھی تو نئے اور اجنبی ماحول کو دیکھ کر اُس کی بھویں سکڑ گئیں۔ فوراً ہی اسے یاد آیا کہ رات وہ اپنے نئے گاہک کے ساتھ جب اس جگہ آئی تھی تو وہسکی کے نشے میں دھت تھی۔ اس نے اپنے پہلو میں نظر ڈالی، اسکا گاہک برہنہ سو رہا تھا۔ میگی نے پھر اپنے بدن کو دیکھا۔ وہ بھی ننگی پڑی تھی۔ غور کرنے لگی کہ رات سب کچھ شروع کیسے ہوا تھا۔ خود اُس نے اپنے کپڑے اتارے تھے یا اس کے گاہک نے۔ اور وہ کب بستر پر لیٹی اور پھر کیا ہوا۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو یہ سوچ کر ایسے تو ہوا ہی کرتا ہے وہ اٹھ گئی اور غسل خانے کی طرف چلی۔ بتی اب تک جل رہی تھی وہ بجھا دی۔ گھڑی دیکھی تو سویرے کا کوئی وقت تھا لیکن دن چڑھا دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ گھڑی بند ہے۔ اس نے صحیح وقت معلوم کرنے کے لیے ٹیلیفون ایکسچینج کو ٹیلیفون کیا۔ ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی ایک مترنم نسوانی آواز نے اسے صحیح وقت بتایا۔ یہ خود اسی کی آواز تھی۔ جب سن کر اُسے نشہ سا آجاتا تھا۔ کئی دفعہ تو محض اپنی آواز سننے کو میگی وقت معلوم کرنے والا نمبر ٹیلیفون پر گھمایا کرتی تھی۔

غسل خانے سے تروتازہ جب وہ لوٹی تو بستر خالی تھا اور باورچی خانے میں چلی گئی - اس کا کنوار اگاہک جو اس فلیٹ میں اکیلا رہا کرتا تھا ناشتہ تیار کر رہا تھا - ساس پین میں انڈے تلے جا رہے تھے - مکھن اور ساسجس کے ڈبے کھلے پڑے تھے - اسکا گاہک رات کی باتیں دہرا کر اُسے چھیڑنے لگا - ایک تو میگی کو رات کی باتیں یاد نہیں تھیں اور نہ اسے ان باتوں کے سننے میں کوئی دلچسپی تھی - قریب قریب ہر گاہک سے اُسے ایسی باتیں سننے کا موقع ملتا تھا اور اسے ایسی باتیں سن کر مسکرانے اور شرمانے کی عادت ہی ہو گئی تھی - اس کو مسکراتا اور شرماتا دیکھ کر اسکا گاہک تصور ہی تصور میں پھر سب کچھ کرتا رہا اور خیالی مزے لوٹتا رہا -

ناشتہ ہو چکا اور وہ جلنے لگی تو اُس کے گاہک نے اُسے سو روپے دیئے اور بڑی گرمجوشی سے وداعی بوسہ لیا - اُس کو میگی کے منہ سے رات کی وہسکی کی بو ابھی تک آ رہی تھی چلتے چلتے میگی کی نظر پلنگ سے لگی چھوٹی سی میز پر پڑی جہاں وہ اپنے گلے کی سونے کی زنجیر جس کے بیچوں بیچ ننھی سی خوبصورت سی صلیب لگی تھی، رکھ کر بھول چکی تھی - اس نے وہ اٹھا کر گلے میں ڈال لی اور چلی گئی -

میگی چل تو رہی تھی فٹ پاتھ پر مگر اس کی نظریں سڑک پر کسی خالی ٹیکسی کو روکنے کے لیے دوڑ رہی تھی - کچھ دور ایک ٹیکسی اس کے قریب ہی آ کر رکی جس سے ایک بھاری بھرکم برقعہ پوش خاتون اترنے لگی - ٹیکسی سے اترتے ہوئے برقعہ پاؤں سے الجھا، وہ گرنے ہی لگی تھی کہ میگی نے اُسے سنبھال لیا لیکن خود اس کے بوجھ کے دھکے سے گر گئی - نئے فیشن کے تنگ دامن کا اسکرٹ پہنے ہونے کی وجہ سے وہ اٹھ نہ سکتی تھی - اُس نے خفت سے چاروں طرف دیکھا - کچھ راہ گیر آس پاس کھڑے مسکرا رہے تھے - برقعہ پوش خاتون اتنے میں اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھی - اس نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا اور وہ ہتڑ لگا کر ڈھکیل دیا - اس نے جلدی سے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھول لیا - یہاں بھی اسکرٹ کی تنگ دامانی نے راستہ روکا...... ایک کے بعد دوسرا پاؤں یوں ٹیڑھا کر کے اندر داخل ہوئی جیسے یہ بھی ایک قسم کا رقص ہے -

ادھر مجمع میں ایک ڈاڑھی والے بزرگ ارعربی کی اصلی احمد گاڑھی رع دالی "لعنت" کہہ کر اپنا راستہ لینے لگے - ایک نوجوان جو کالج کا طالب علم لگ رہا تھا - تڑپ گیا - اُسی گاڑی رع کا استعمال طنزیہ طور پر جاری رکھتے ہوئے بولا -

"یہ زعفران ہے قبلہ زعفران - آپ کیا قدر فرمائیں گے بھلا؟"

سب ہنس پڑے۔ بزرگوار نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ برقعہ پوش خاتون نے اپنی ہنسی کو چھپانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر فوراً ہی برقعے کا خیال آیا تو ہاتھ گرا دیا۔ ایک منچلے نوجوان نے یہ دیکھ لیا تھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ہائے کیا ادا ہے۔ سبحان اللہ"

میگی کی ٹیکسی بہت دور نکل چکی تھی۔ اضمحلال سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح اُسی کے پر لگ جائیں اور وہ پلک جھپکتے گھر پہنچ جائے۔ ایسے میں ایک سہ راہے کے پاس اس کی ٹیکسی کو رکنا پڑا۔ سہ راہے پر بہت مجمع لگ گیا تھا۔ تینوں سڑکوں پر ٹریفک تھم گئی تھی۔ لگتا تھا کوئی سخت قسم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ایک لاابالی آدمی جائے واردات کی طرف سے سڑک کے بیچوں بیچ چلا آ رہا تھا۔ جب وہ میگی کی ٹیکسی کے پاس سے گذرنے لگا تو ڈرائیور نے پوچھ لیا "کیا بات ہے"

"ایکسیڈنٹ" وہ بولا "ایک ہرس اور ایک ایمبولینس کار کی ٹکر ہو گئی۔ وہ اُدھر سے آ رہی تھی، یہ ادھر سے جا رہی تھی۔ دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک دوسرے سے چپک گئیں۔ ہرس کا ڈرائیور مر گیا اور ایمبولنس کا ڈرائیور بری طرح زخمی پڑا ہے۔ ایک اور ایمبولینس اس کے لیے بلوائی ہے"

وہ مخاطب تو تھا ٹیکسی ڈرائیور سے مگر اس کی بھوکی نظریں میگی پر لگی تھیں۔

ڈبوں کے غذائی سامان اور کچھ پیکٹوں سے لدی ہوئی میگی اپنے چھوٹے سے مگر قرینے سے سجے سجائے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ اس نے ڈبے کھانے کی چھوٹی سی میز پر رکھ دیئے۔ اسکرٹ اتار کر صوفے پر پھینک دیا اور سینڈل پلنگ کے نیچے کر دیئے۔ الگ الماری کھول کر اس نے جن کی بوتل نکالی اور منہ سے لگا لی۔ چند گھونٹ یونہی پی لینے کے بعد اس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور سو گئی۔

نہ جانے کتنی دیر گذر گئی۔ بڑے زور زور سے بجنے والی گھنٹی نے اسے بڑی مشکل سے جگایا۔ اس کی آنکھیں کھلنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ جیسے میگی خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آنے کو تیار ہی نہ تھی۔ ادھر گھنٹی بے نام وقفوں سے مسلسل بج رہی تھی نہ جانے کون ملاقاتی ہے۔ وہ گھنٹی کے زور پہ اٹھ گئی۔ ہاؤز کوٹ اٹھا لیا اس کے بازو شل ہو گئے تھے اور وہ اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ پیٹی کوٹ پر ہاؤز کوٹ پہننے کے بجائے اس نے صرف کندھے پر ڈال لیا اور نیند اور نشے کی لہروں پر دروازے تک ڈولتی چلی گئی۔

دروازہ کھولتے ہی اُس نے ایڈی کو کھڑا مسکراتا دیکھا۔ ایڈی اس کا بوائے فرینڈ تھا۔ ایڈی کو دیکھتے ہی میگی کی بجھی ہوئی آنکھوں میں دیئے جل اٹھے اور ہونٹوں کے کنول کھلنے لگے۔ ایڈی نے فوراً ہی اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور اپنے چوڑے شانوں اور بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں میگی کو سمیٹ لیا۔ میگی کے مردہ جسم میں زندگی سانس لینے لگی۔ اچانک ہی ایک بھرپور طاقت کا احساس کر کے اس نے اپنی باہیں ایڈی کی ہستی میں جذب ہو جانے اور گھل مل جانے کی کوشش کرنے لگی۔

ایڈی کئی دن کے بعد آیا تھا۔ ابتدائی بے زبان گلے شکووں کے بعد جب ذرا سانس لینے کا موقع ملا تو ایڈی نے بتایا کہ اُسے بڑی بھوک لگی ہے۔ میگی نے جلدی سے کارنڈ بیف کا ایک ڈبہ کھولا اور اُسی بیف کی چربی میں اُسے تھوڑا سا پکا کے اس کے بہت سے سینڈوچ بنائے اور ایڈی کو خود اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔ ایڈی بھی اسکو اپنے ہاتھ سے کھلاتا رہا۔ اور جب ایک بھوک کا سلسلہ ختم ہوا تو دوسری بھوک کا شروع ہونے لگا۔ میگی نے اپنے آپ کو ایڈی کے حوالے اس طرح مکمل طور پر کیا کہ رات بھر کے ہزار روپے دینے والے گاہک سے بھی وہ ایسی خود سپردگی سے کام نہ لیتی۔ اور پھر ایڈی نے تانسہ لیک پر پچھلی چاندنی رات میں میگی کے ساتھ اڑاتے ہوئے مزوں کا جب ذکر شروع کیا تو بات دو آتشہ ہو گئی۔

ایڈی جانے لگا تو میگی نے اپنا پرس کھول کر پچیس روپے نکالے اور اس کی جیب میں رکھ دیئے، ایڈی نے رسمی طور پر کچھ تکلف یا شکریئے کی بات کرنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ میگی نے اپنے ہونٹوں سے اُسے بند کر دیا۔

ایڈی کے جانے کے بعد میگی پھر لیٹ گئی۔ دوہری تھکن کے زیر اثر اس دفعہ وہ پہلے سے بھی زیادہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

جتنی طویل اور گہری نیند اس کی تھی میگی نے محسوس کیا کہ اتنے ہی طویل اور گہرے بوسے نے اسے جگانا شروع کیا ہے۔ کچھ دیر تک تو وہ محض اسے خواب ہی سمجھتی رہی لیکن کھچاؤ کی شدت اور کسی کی سانسوں کی گرمی سے جب آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ، آہستہ آہستہ اسکی آنکھیں کھلتی رہیں تو سرمئی دھندلکوں میں نسیم کا وجود اس کے بدن پر چھایا ہوا دکھائی دیتا گیا۔ نسیم اس کا شوہر تھا۔ فلیٹ کی ایک زائد چابی اس کے پاس رہتی تھی۔ وہ شام کو ریلوے ورکشاپ میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر لوٹا کرتا تھا۔

"وسیم - مائی لو"

"ڈارلنگ" وسیم نے اس کے گال پر اپنا گال رکھ دیا "میگی! معلوم ہوتا ہے رات کوئی اچھا مرغا پھانسا تھا۔ بڑا سامان لائی ہو"

"دیکھو مجھے تمہارا کتنا خیال ہے اور تم سے کتنا پیار ہے۔ تمہارے لیے ٹریلین کی نئی شرٹ لائی ہوں"

"تو کیا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرتا؟"

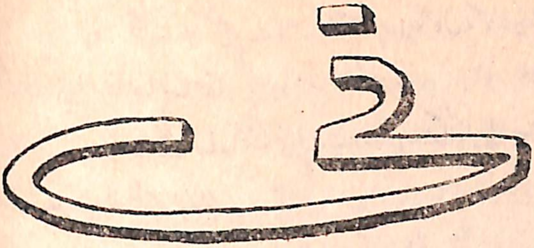
"آج میں نے بھی اپنے ورکشاپ کے منیجر کو دعوت دی ہے۔ بڑا شوقین ہے اور کافی پیسے والا ہے۔ بہت رشوت کماتا ہے۔ آخر یہ پیسہ اس کا جائے گا کہاں؟"

"او ڈیر" بڑے پیار سے یہ کہہ کر میگی اس سے چپک گئی۔

وسیم نے لیٹے ہی لیٹے ہاتھ بڑھا کر لیمپ کا بٹن دبا دیا۔

صرف راتوں ہی پر مشتمل زندگی بسر کرنے والی میگی کا دن طلوع ہو رہا تھا۔

مدرا راکھشس



صرف ایک سستے سے جاز پر بھی رُوبی ضرورت سے زیادہ مٹکتی ہے، جیسے گھوڑی اپنے اوپر بیٹھنے والی مکھیوں کو اڑانے کے لئے اپنے پٹھوں کو حرکت دے رہی ہو۔ یوں تو وہ بہت بُری لگتی ہے لیکن گاتی بہت اچھا ہے۔ خاص طور پر یہ گیت ـــ سورج کے دیش میں ایک جزیرہ ہے، جہاں میں تمہارا انتظار کروں گی ہمیشہ......

رُوبی انتظار نہیں کرے گی، یہ حقیقت ہے کیونکہ رات تک وہ بہت تھک جاتی ہے۔ گھر جانے ہی وہ سوجایا کرتی ہے۔ تجھے ماحول میں رنگ لانے کے لئے اس کا بھائی بیچ بیچ میں اُٹھ کر اُس کے ہمراہ ناچتا ہے۔ تاکہ اور جوڑوں کو بھی اٹھنے کا بہانہ میسر ہو سکے۔ لیکن لوگ بیٹھے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں لیکن رُوبی اب کسی کا انتظار نہیں کرتی۔ اسی بار، میں اس سے پیشتر وہ اپنے باپ کے ہمراہ ناچا کرتی تھی "جو گنوریا" سے چل بسا۔ دو سال سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ ناچا کرتی ہے جو آج کل ایک ہندوستانی اسکول ماسٹرنی کے ساتھ بھاگ نکلنے کے فراق میں لگا ہوا ہے۔ شائد رُوبی دو مہینے کے بعد اپنے بیٹے کے ساتھ ناچ کر کام چلانا شروع کر دے گی۔ وہ کسی واقعہ کا انتظار نہیں کرتی۔ وہ پہلو بدل لیتی ہے اور واقعہ اس کی بغل سے گزر جاتا ہے۔ اس لئے رُوبی کبھی بات کا مطلب جاننے کی سعی بھی نہیں کرتی اپنے گائے گیت کی کڑی کا مطلب بھی اُسے یاد نہیں رہتا جیسے کوئی نیند میں بڑبڑائے اور تکیہ کھینچ کر چپٹالے اسی طرح رُوبی گیت گاتی ہے۔ ہم کبھی سنتے ہیں ـــ سورج کے دیش میں ایک جزیرہ ہے......

ڈیزی جاپانی پنکھے کی طرح کی اسکرٹ اور بلیرڈ کھیلنے والی چھڑی کی ا سا جسم لئے گزرتی ہے اور جُھکا کر میری ٹیبل پر رُوبی کے گیت کی پیروڈی سُنا جاتی ہے ... رُوبی کے کولہوں پر بناوٹی گدی ہے......

ڈوبی کی گدی ایک دن ناچتے ناچتے اسکرٹ سے سرک کر گر پڑی تھی۔ ڈوبی جھینپی نہیں اُس نے ہال کے کنارے آکر گدی ٹھیک کرتے ہوئے کہا ــــ ڈیزی، اگر تم اپنے بستر پر بناوٹی طریقے اپنا کر خود پر نہیں ہنستی ہو تو جنت کے نام پر میرے نقلی کولہوں پر ہنسنے سے باز آؤ۔

ڈوبی کی للکار سن کر ہر مسکرانے والے کی مسکراہٹ سمٹ گئی جیسے لیکوپلاسٹ سے چپکائے زخم کے لب پھیل کر سمٹ گئے ہوں۔ یہ سچ ہے کہ لوگ نہیں لوگوں کے زخم مسکرائے تھے۔

اعجاز نے ادب سے جھک کر سوڈے کی بوتل اٹھائی اور بولا ــــ "آج صاحب کے گلاس میں اپنے ہاتھ سے سوڈا ملانے کو جی چاہتا ہے۔"

میں خوش ہوگیا، ناراض ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں نے اعجاز کو اشارہ کیا کہ وہ میری سکیم کو میری یاد دِلادے۔ اعجاز نے بڑی علیمی سے کہا وہ طے ہو چکی ہے۔ کل اُسے ایک پارسی بک کرا گیا تھا دو نوں کے لئے۔ وہ ابھی آتا ہی ہوگا۔ میری سکیم ــــ کہتے ہیں کہ میری سکیم کسی زمانے میں اس بار کی سب سے اچھی آمدنی رہی ہے۔ دورانِ جنگ جب سارا کلکتہ خالی ہو گیا تھا، میری سکیم کی بدولت ہی یہ 'بار' چلتی رہی۔ میری سکیم اُن دنوں لگ بھگ تیرہ سال کی تھی جبکہ اُس نے فوجی میجروں تک سے ناک رگڑوائی تھی۔

اس پارسی کو میں جانتا ہوں۔ ایلیٹ روڈ پر اس کا ایک ہوٹل چلتا ہے۔ کل وہ اسی 'بار' کے مالک سے 'فلوک' کا ذکر کر رہا تھا، یہ اعجاز نے ہی مجھے بتایا تھا۔ 'بار' کے مالک ایڈ گر نے اس سے کہا کہ ڈبل فلوک خطرناک ہے۔ سنگل فلوک چلایا جا سکتا ہے۔ اس میں لڑکیاں گاہک لاتی ہیں اور محض مسافر کی حیثیت سے ٹھیرتی ہیں اس میں آسانی یہ بھی ہے کہ ایسے ٹھیرنے والے لوگوں سے بل واپس لے لیجئے اور اُس پر CANCELLE کی مہر لگا کر رکھ دیجئے۔ انکم ٹیکس سے بچت ہو گی۔ پارسی شروعات کے لئے میری سکیم کو گانٹھنا چاہتا ہے۔ وہ دس بجے آئے گا۔

ابھی ساڑھے نو بجے ہیں۔ ڈوبی ناچ رہی ہے۔ کیا ناچتی ہے۔ یہ کہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ بینڈ صرف 'والٹز' کا ہے لیکن ڈوبی اور اس کے بھائی کے قدم 'فاکس ٹراٹ' تک پہنچے ہیں۔ اور ان کی رفتار شاید 'ٹینگو' سے بھی زیادہ گھماؤ دار ہے۔ ڈوبی کا ہر ناچ ایک ہلکے پھلکے ایکسکیوزمی (EXCUSE ME) سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہ اتنا ہی بے اثر ہوتا ہے کہ جیسا کہ تھکے ہارے کے لئے گولڈن ایگل کا جھاگ ــــ صرف جھاگ!

زندگی بھی جھاگ ہے صرف جھاگ! اُس کے بلبلے دوسرے کے گلاس میں پھوٹتے ہیں۔

اور چھینٹے ہم پر پڑتے ہیں۔ جھاگ کے چھینٹے صرف چڑچڑاہٹ پیدا کرتے ہیں۔ ڈیزی، میری، سکم، اُروبی سبھی جھاگ کے اُبلتے پھوٹتے بُلبلے ہیں جن کے چھینٹوں کی تشنہ کامی ہمیں چڑچڑا بنا دیتی ہے۔

گذشتہ کئی دنوں سے جھاگ اُڑا رہی ہے ایک بزیز لڑکی۔ اس نے لوگوں کو ہر روز اپنی زندگی کی ایک نئی کہانی سنائی ہے۔ خوبصورتی میں اس کا جواب نہیں — نارڈیکین خون ہے!

مجھے دیکھا، مسکرائی اور اٹھ کر میری ٹیبل پر آ بیٹھی۔ اعجاز اچھا آدمی ہے۔ وہی ہے جو کسی بھی لڑکی کو کسی بھی ٹیبل پر پہنچا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ طوائف سے عشق بے کار ہے۔ لیکن طوائف پرستش ہو، یہ حقیقت ہو سکتی ہے۔ ایسی جس میں پٹرول کی طرح تیکھی بو ہو اور روئیں دار کپڑے کی طرح چھو کر جلن پیدا کر دینے کا مادہ ہو۔ ایسی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی خارش کو ناخن سے کھرچ دینے کو من چاہے اور ایسی کہ جیسے ٹوٹی دیوار پر ناگ پھنی اُگ آئے اور اچھی لگے جیسے ناخن کے بیچ ایک تیز کانٹا چبھ جائے اور ننھی چمکیلی، شوخ اور گرم خون کی بوند چمکنے لگے اور ایسی۔ وہ کمسن توہم و نازک، اور رنگین لڑکی۔ ایک صحیح جسم میں بھر گئی حرارت کی طرح کہ جیسے کھٹ ٹیلی ہو — خوب چمکدار، جیسے وارنش کے رنگوں میں پتی ہو، جھلملی! اسے دیکھا تو محسوس ہوگا کہ ہمیں نہا لینا چاہیئے اور پھر خدا سے دعا مانگنی چاہیئے کہ وہ ہمیں اندھا کر دے تاکہ ہم دیکھنے لائق نہ رہیں۔ ہماری زبان کاٹ لے، تاکہ ہم گناہوں کے ثمر کا ذائقہ جاننے کے اہل نہ رہیں۔ ہماری باہوں کو لوہے کی شہتیر سے جکڑ دے کہ ہیں — لیکن میں صرف چڑچڑاتا ہوں، جب زندگی جو جھاگ ہو گئی ہے۔ اس کے چھینٹے مجھ پر پڑتے ہیں۔

ان تمام لڑکیوں میں صرف نی ہی ایسی ہے جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے، اور سب سے زیادہ ناپسند۔ پارسی تجو بھائی کی گنجی چندیا پر اس نے بھرے ہال میں اپنی جلتی ہوئی سگریٹ چھوا دی تھی اور وہ تلملا اٹھا تھا۔ نوجوان مارواڑی جیو کرے شیام لال کا جڑواں نے ابھی کچھ دن پہلے اس سے ناچنے کے لئے درخواست کی تھی تو اس نے تہذیب کے خلاف اس سے کہا کہ وہ ہم جنس جوڑا بنا کر ناچنا پسند نہیں کرتی۔

نی نے میری میز پر آتے ہی کہا — "میرا نام تمہیں یاد ہے؟"

"نہیں میں بھول گیا"

"کے س۔ بی یاد رہے گا؟"

"کوئی خاص نام نہیں پھر بھول جائے گا۔"

"میں پھر یاد دلا دوں گی"

"ردی اور گندی چیزوں کے لئے تمہاری یادداشت کیا اتنی تیز ہے؟"

نی نے مسکرا کر جواب دیا ۔۔ "کیونکہ ایسی ہی چیزوں سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے"

"کتنے روپے لوگی؟"

نی نے میری آنکھوں میں جھانکا، مسکرائی جیسے نہانے سے پہلے دان پر سرد پانی کے چھینٹے مار کر ہمت تول رہی ہو پھر بولی "بہتر ہے کہ ایک دور ہو جائے"

"گھبراؤ نہیں تمہارے پیسوں سے شراب نہیں پی جائے گی"

"بے کار اپنی ایمانداری کا پرانا کوٹ مت دکھاؤ۔ یہ ایمان کسی بھی کباڑی کی دوکان پر مل سکتا ہے۔ چالیس روپے!" ۔۔ نی نے پتلی ننھی سگریٹ ہونٹوں میں دبائی اور ادھر میں نے آگے بڑھ کر اپنے لائٹر سے اسے سلگا دیا۔ نی نے ڈھیر سا دھواں میز پر اڑا دیا۔

"چالیس روپے؟ صرف؟ میں نے تو تمہیں اس سے کہیں زیادہ کا سمجھا تھا"

"ٹھیک ہے باقی روپیہ میری طرف سے کسی بھکاری کو دے دینا"

"میں بھکاری اور تم میں کچھ فرق بنائے رکھنا چاہتا ہوں"

"لیکن بھکاری کو دان دے کر ثواب حاصل کرنے اور طوائف کے پاس جا کر گناہ کرنے والے میں میں کوئی فرق نہیں سمجھتی"

"تم مانتی ہو کہ تمہارے پاس آنا گناہ ہے کافی پر ہمت بے شرمی ہے"

"کیونکہ تمہیں اسے ثواب کہتے ہوئے بزدلی کی حد تک شرم محسوس ہوتی ہے"

"ورنہ کیا تم اسے ثواب بھی مان لیتیں؟" میں نے پوچھا۔

"اگر گناہ مان سکنے کا جواز تم دے سکو تو شاید"

"میں اس وقت فلسفہ میں دلچسپی نہیں لینا چاہتا" ۔۔ میں نے آخری بات کی۔

مگر نی کچھ زیادہ ہی طرار ہے۔ وہ چھوٹتے ہی بولی ۔۔ "میں لیلیٰ مجنوں کے قصوں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی"

لیکن بات شاید ابھی میرے ہاتھوں سے پوری طرح بے قابو نہیں ہوئی تھی ۔۔ "مگر میں چالیس روپے دے سکتا ہوں۔ ایسی حالت میں تمہاری کیا دلچسپی ہے؟"

نی کھل کر مسکرائی اور سگریٹ کی ڈبیا میز پر سامنے کھسکا دی۔ میز پر شیشے پر انگلی

سے ایک دائرہ بنایا اور بولی "میں یہ چالیس روپے چھوڑ بھی سکتی ہوں"۔
"سودا طے نہ ہو یہ الگ بات ہے۔ لیکن قیمت تمہاری چالیس روپے ہی ہے"۔
"معاف کرنا پیارے ٹرین کا کرایہ دیتے ہو تو کیا ٹرین تمہاری ہو جاتی ہے؟"
میں نے کرسی پر کروٹ بدلی۔ ہال پر ایک اکھڑی نظر دوڑائی اور نی سے پوچھا۔
"کیا پیو گی؟"
وہ بولی۔ "تمہاری مجبوری"۔
مجھے لگا اب میں نی کو اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تیکھے لیکن سیدھے گلے سے میں نے ایک گہرا طنز کیا۔ "تم راہبہ اچھی بنتیں"۔
نی نے جیسے ایک معصوم بچے کی طرح چہرہ لٹکا کر کہا۔ "مذہب کو کوٹھے میں لا کر اس کا مذاق نہیں اُڑایا کرتے"۔
میں نے جیسے بے طرح آپا کھو کر کہا۔ "بہت تیز ہو رہی ہو"۔
نی نے میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا اور بولی "میں صرف سُننا چاہتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو"۔
"روز روز ہر آدمی سے ایک ہی بات سُن کر تمہارا جی نہیں بھرا؟"
نی چپ چاپ میری بات سُن کر مسکراتی رہی۔ پھر پرس سے اپنا آئینہ نکال کر لپ اسٹک ٹھیک کی، ایک بار داہنے بازو سے اپنی ہتھیلی رگڑی اور مجھے گھورنے لگی۔
میں نے اپنی جیت دیکھ کر پھر کہا۔ "بہتر ہے اب کسی ہلکے پھلکے ٹاپک پر بات کرو"۔
سامنے کی میز پر بیٹھی لڑکیوں کے جھنڈ کے پاس کوئی چھیلے ہوئے انڈے کے رنگ کا آدمی آیا اور ایک پل گھور کر آگے بڑھ گیا۔
نی نے مسکراہٹ سمیٹ کر پوچھا۔ "مثلاً؟"
"مثلاً روبی کے بارے میں، چاند کے بارے میں، کسی مزیدار واقعہ کے بارے میں....."
"موسم کے بارے میں، ایک دوسرے کے کپڑوں کے بارے میں!"
"کچھ برا نہ ہوگا!" میں نے کہا۔
نی پھر مسکرائی۔ یوں محسوس ہوا کہ اس کی مسکراہٹ ہونٹوں کی نہیں، بدن سے کھیلتے ہوئے کپڑوں کی ہے۔ اس نے میرے کپڑوں کی طرف نظر اٹھائی۔ کالی پینٹ، کالے جوتے

کالی ٹائی سفید قمیص اور پوچھا۔ "تم کہیں بٹلر ہو؟"

میں جیسے تراش گیا۔ کروٹ بدلتے ہوئے میں نے جواب دیا۔ "اوہو اب یاد آیا تم اسی ریستوران میں بیرا تھی نہ؟"

میرے جواب نے اُسے چھوا تک نہیں لیکن وہ کچھ مضمحل سی ہو گئی۔ کتھم گئی۔ شاید اس لیے کہ جاز تھم گیا تھا اور رُوبی اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر میزوں کے بیچ آ کھڑی ہوئی تھی 'ایم سی'، پائپ بجانے والے نیگرو سے بات کرتا ہوا اپنی پھٹی ہوئی آستین کوٹ میں چھپاتا جا رہا تھا۔

میں اعجاز کو بلا کر تی کے لیے جن لانے کے لیے کہنے لگا۔ تی نے ایک نظر اپنی گھڑی پر ڈالی پھر یکایک اپنا پرس سنبھالا اور اعجاز کو جن لانے سے منع کر دیا میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے گھورا وہ مسکرائی مجھے یوں لگا جیسے مجھے کوئی سانپ چاٹ گیا ہو۔ اس نے میری ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے گال پر مل کر لوٹا دی وہ بولی۔ "اب چلنا چاہیئے"

داہنے ہاتھ کی میز پر بیٹھی لڑکی اٹھ کر کاؤنٹر پر گئی اور اپنے ساتھ پی گئی شراب کے کمیشن کے پیسے لے کر واپس لوٹنے لگی اس کے ساتھ کا مدراسی، جس کی ایک آنکھ پتھر کی اور ایک ٹانگ لکڑی کی تھی، اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں تی کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔

× × ×

تی مجھے گلیوں میں لے چلی۔ مجھے لگا وہ کچھ ضرورت سے زیادہ تیز چلنے کی عادی ہے۔ اس وقت وہ بالکل خاموش چل رہی تھی۔ میں نے پوچھا تو وہ میری طرف بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر مسکرا دی۔ پھر چلتے چلتے وہ رُکی اور مجھ سے پوچھا۔ "بھیڑ تمہیں کیسی لگتی ہے؟"

میں نے کچھ جواب دینا چاہا لیکن اسی نے پھر کہا "میں سچ سچ ایمانداری سے کہتی ہوں جب میں بھیڑ میں خود کو دیکھتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے میں بڑی بے بس، بے سہارا ہوں اور اس اکیلے پن سے مجھے دہشت ہوتی ہے"

گلی کے دوسرے کنارے پر گیس لیمپ کی سرد روشنی میں کسی ہاتھ والے رکشے کی پرچھائیں نظر آئی اور دائیں طرف کی گلی میں مڑ گئی۔ ہمارے پہلو سے کترا کر ایک موٹا سا کتا ہمیں گھورتا ہوا آگے لپک گیا۔ تی کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ کچھ لڑکھڑائی اور پھر سدھ گئی۔ وہ کہتی رہی۔

جانتے ہو، اکیلاپن مجھے اکتاتا نہیں، اس لئے میں زیادہ بولتی ہوں!"

میں نے خاموشی توڑ کر کہا "وہ بھی اتنی ترش اور گھٹیا باتیں!"

نی ہنس پڑی۔ ایک لرزش سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک ادا کی طرح میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی "تب کیا اچھی اور میٹھی کروں یعنی کہوں کہ میں تمہیں بے حد پیار کرتی ہوں، تم میری زندگی کا سپنا اور تم..... تمہیں نہیں جانتی لیکن مجھے تو یہ سب سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ سب الفاظ نہیں ہیں بلکہ کسی شرابیوں کی بدبو بھری الٹیاں ہوں!" نی نے بڑی نزاکت سے تقریباً پھر کہنے لگی "یہ ترشی اور گھٹیاپن کم از کم صاف ستھری اور تازہ دم تو ہیں!"

گیس کی سرد روشنی اس کے گالوں پر چمکی اور ماتھے پر ہوکر پیچھے سنہری بالوں پر اتر گئی۔ ہمارے سائے لمبے ہونے لگے۔ پاس کی کسی گلی میں ایک ٹیکسی یا پرائیوٹ کار کا دروازہ بند کیا گیا اور اس کے چالو ہونے کی آواز آئی۔

اگلے گیس لیمپ کے قریب شاید کسی پان والے کی دوکان تھی۔ دوکان کی روشنی گلی پہ پڑ رہی تھی کھمبے کے سہارے ٹکا کوئی آدمی منہ میں سگریٹ یا بیڑی دبائے ماچس پر ماچس جلائے جا رہا تھا۔ دوکان کے قریب پہنچنے پر منہ کی بیڑی جلانا چھوڑ کر اس نے ہمیں گھورا اور بنا بیڑی سلگائے ہی کھمبے سے الگ ہوکر دوسری جانب چل دیا۔ دوکان کے قریب ہی بائیں طرف ایک چوڑے ٹوٹے پھاٹک پر نی ٹھٹکی، وہاں پر شاید ایک نیکھی نگاہوں والا دربان بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا مونچھوں والا چہرہ اٹھا کر مجھے گھورا۔ نی نے مڑ کر کہا "اسے دو روپے دیدو"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ روپے گن کر دیکھے اور جیب سے باہر نکال لئے۔ ایک دو تین چار پانچ — گنے پھر دوہرا کر دو گنے اور نکال کر دربان کو دے دیئے۔ اندر بائیں طرف ٹین کا ایک سائبان تھا جس میں چار پانچ ادھیڑ عمر کے مسلمان سوٹ کیس بنانے میں مصروف تھے۔ پچھلی دیوار کی کھونٹی پر ایک دھندلی سی لالٹین لٹکی تھی۔ ایک معمولی سے بجر پارٹیشن کا دروازہ کھول کر نی اندر داخل ہوئی پھر باہر جھانک کر مجھے بھی بلایا۔ اندر آکر مجھے رسوئی کی طرح سی کوئی جگہ لگی۔ نی نے اشارے سے مجھے دوسرے دروازے سے اندر بلایا۔ دوسرے کمرے کو پار کر ایک آنگن سا آیا۔ اس کے بعد ایک کمرہ اور آیا جو کافی سجا دھجا تھا اس میں کوئی شک نہیں۔ لکڑی کا پلنگ، موٹے جوٹ کے گدے پر ہلکا روئی کا گدا اور اوپر ایک سفید چادر، تکیے، تولیہ.....

نی نے تولیہ کھونٹی پر لٹکایا۔ ایک لمحے کے لئے مجھ سے معافی مانگ کر وہ باہر چلی گئی۔ تنہائی

میں مجھے محسوس کر میں اُلٹے قلم سے لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بے تُکاپن، ایک بے ڈھنگی اکتاہٹ سی جیسے مجھے سُونگھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی نی لوٹی۔ اس کے ہاتھ میں تام چینی کا پانی سے بھرا ہوا ایک بڑا سا تسلا تھا۔ تسلے کو پلنگ کے پائے تانے زمین پر رکھ کر وہ میرے قریب آئی۔ اب نی وہ چکنا خوبصورت مچھلی کی طرح پھیلنے والا فراک نہیں صرف ایک چولی اور سکرٹ پہنے تھی۔ کیا اس فراک کے ساتھ نی نے اپنے آپ کو بھی کسی ہینگر پر لٹکا دیا تھا؟ سفید دھاری دار داغوں سے بدشکل اس کے پیٹ کا وہ عریاں حصہ — نہیں نی فراک کے ساتھ ہینگر پر لٹکا دی گئی ہے۔ یہ سامنے کھڑی نی نہیں صرف ایک فالتو پڑی کھونٹی ہے جسے مکھیوں نے بیٹ کر گندہ کر دیا ہے۔

نی مسکرا رہی تھی۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے کھونٹی ہی اپنی گھنڈی ہلا ہلا کر مکھیاں اڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس نے کہا "آپ کپڑے کیوں نہیں اتارتے؟ کیا شرم لگتی ہے؟"

ساتھ والے کسی کمرے سے کوئی ننھا بچہ چیخ چیخ کر رو اٹھا۔ نی چونکی اور کچھ بے چین سی ہو اٹھی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر سنبھل کر مجھ سے کپڑا اتارنے کو کہا۔ بچہ دوبارہ چلایا۔ تیسری بار اور پھر بُری طرح سانس گھونٹ کر لمبی لمبی ہچکیاں لینے لگا۔ کسی مرد کی دبی دبی بڑبڑاہٹ کانوں میں پڑی اور ایک تیز جھٹکا لے کر بچہ چپ ہو گیا لیکن ابھی وہ خاموش نہیں ہوا تھا۔ ایک گہری خاموشی کے بعد جیسے بڑی دیر سے کھنچی ہوئی چیخ بھر بھرا کر پھوٹی۔ نی نے مجھ سے معافی مانگی صرف ایک لمحے کے لیے اور اندر چلی گئی میں پھر تنہا رہ گیا۔ بے تکی اکتاہٹ کو لپیٹتا اور اُتارتا ہوا۔

بچہ چپ ہوا اور تھوڑی دیر بعد مرد کی آواز آئی — "بچہ پھر روئے گا اور میں چاہتا بھی نہیں کہ وہ چپ رہے۔"

"تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟" اس بار نی کی آواز صاف سنائی پڑی۔

"تم بچے کو رکھو۔"

"لیکن کیسے ہو سکتا ہے؟"

"لیکن میں ہر رات بچے کی تیمارداری نہیں کر سکتا۔"

"اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

"بالکل غلط بات ہے،، میں کوئی آیا نہیں ہوں۔ رات بھر کھٹولے پر بچے کی دیکھ بھال کے بجائے کسی پلنگ پر عورت کے ساتھ رات بتانے کی ضرورت مجھے بھی محسوس ہوتی ہے۔"

رات کے سناٹے میں یہ آواز مجھے ایسے لگی جیسے اچانک کسی بھاری مشین کا کوئی پرزہ

باغی ہو کر غلط چلنے لگا تو شائد نی نے کچھ کہا اور مرد کی آواز سنائی دی — "نی، تمہارے پیسے لے کر مجھے کسی دوسری عورت کی رات نہیں چاہیئے۔ نہیں چاہیئے نی، تم میری بیوی ہو نی، اور تمہاری رات — نہیں! آج اس آدمی کو لوٹا دو نی، آج کی رات مجھے دیدو نی —— بے بی کو اٹھا لو نی، دیکھو میں نے کافی بنا رکھی ہے۔"

"پاگل مت بنو، بچے کو اٹھا لو" — نی ذرا تیز ہو کر بولی، بچہ پھر چیخنے لگا۔ نی شائد دروازے تک آئی لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے ہی مرد نے اسے کھینچ لیا۔

نی نے دبے گلے سے تیز آواز میں کہا "چھوڑ دو مجھے! پاگل مت بنو۔"

"نی، میں تمہارا آیا نہیں ہوں! جاؤ اس آدمی سے کہہ دو کہ وہ چلا جائے۔ میں تمہارا خاوند ہوں۔"

"ناٹک بند کرو —" نی اس بار بھرپور چیخی۔

"ناٹک!" مجھے لگا شائد مرد غصے سے تھرا رہا ہے۔ اس نے کہا "ناٹک ابھی ہوگا! میں اس آدمی کا خون کر دوں گا، اور — اور"

نی نے شائد چھوٹنے کی کوشش کی۔ بچہ اب بھی ہچکیاں لئے جا رہا تھا۔ مرد نے جیسے پاگل ہو کر پھٹے گلے سے کہا — "نی، آسانی سے کام نہ ہوگا تو میں تم سے زنا بالجبر کروں گا، نی — میں تمہارے ساتھ —"

میں اور سننے کو بیٹھ نہ سکا۔ مجھے لگا جیسے روبی کے گیت والے سورج کے دیش کے اس جزیرے پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ کل رات 'سانتا کلاز' جیسے ڈاڑھی والا میرا ایک دوست کہہ رہا تھا کہ عیسیٰ نے پیشین گوئی کی تھی

MEN SHALL ROB THEIR WIVES AND WIVES SHALL

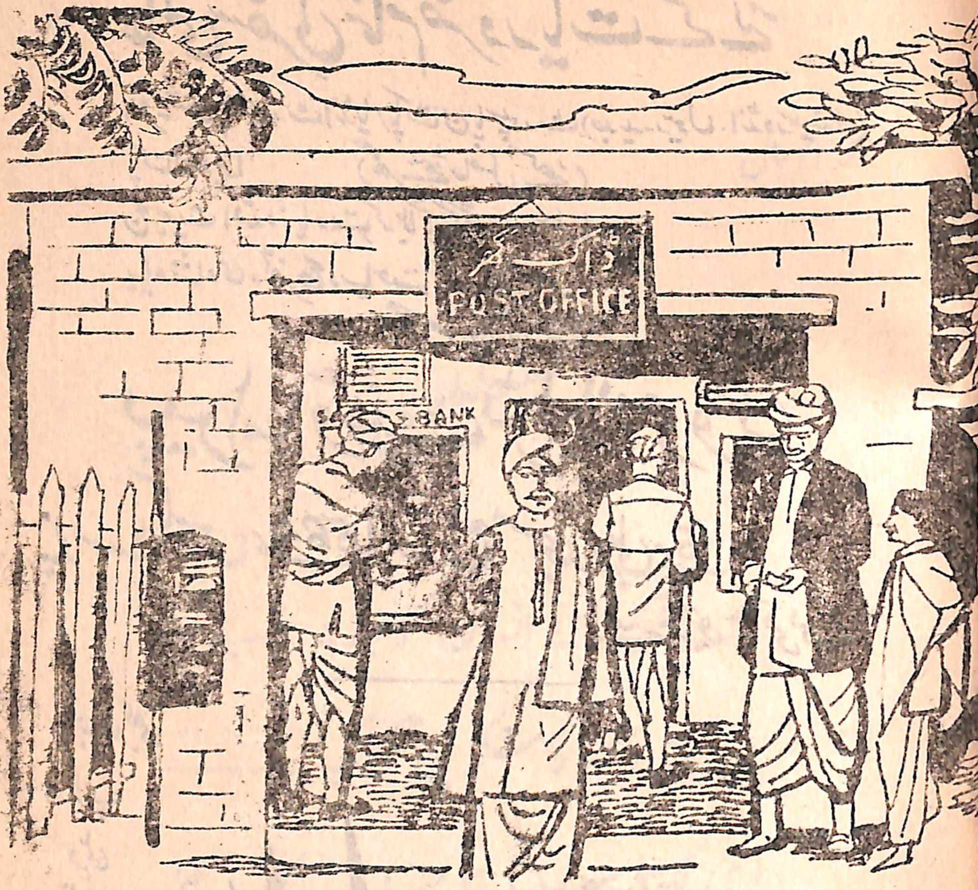
مرد اپنی عورتوں کو لوٹیں گے اور عورتیں ——

میں کل ہی اس جملے میں ایک تبدیلی کروں گا۔

MEN SHALL RAPE THEIR WIVES AND WIVES SHALL

— مرد اپنی عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کریں گے اور عورتیں ——

کرشن ورما



ڈاک خانہ بچت بنک

آپ کے گھر کے قریب ایک بنک

* پوری سلامتی کی پیشکش کرتا ہے
* جب چاہیں، آپ اپنا روپیہ جمع کرا سکتے ہیں
* ضرورت کے وقت اسے نکلوا سکتے ہیں
* ٹیکس سے بری ۳ فیصدی سالانہ سود حاصل کیجئے

قومی بچت آرگنائزیشن

عالمی سفر کی تمام ضروریات کے لئے

انٹرنیشنل پاسپورٹ انڈیا/پاکستان پاسپورٹ (جدید۔ رینول۔ انڈورسمینٹ)
پاکستان ویزا
(گھر بیٹھے حاصل کیجئے)
حج بیت اللہ و زیارت کربلا کی بکنگ و معلومات۔
بیاہ شادی۔ تفریح و سیاحت کے لئے بسیں۔
اور دیگر ضروریات کیلئے

پیرا ماؤنٹ ٹریول سروس

پوسٹ بکس نمبر 1564 جامع مسجد دہلی نمبر 6
سے رجوع کریں

جب بھی
آپ
دہلی
تشریف
لائیں

• کسی بھی وقت
• کسی بھی موسم میں
• کتنے بھی دن کے لئے
• آپ کی خدمت کے لئے تیار ہے۔

ہوٹل ناز

میں قیام پذیر ہوں

جامع مسجد دہلی
ٹیلی فون نمبر ۲۲۲۵۲۵

اختر الایمان

تسکین

اک محقق نے انسان کو بوزنہ جب کہا
میں وہیں سجدۂ شکر میں گر گیا ——
اپنی کوتاہیوں، خامیوں کے لئے
آفرینش سے ابتک جو شرمندہ تھا
آج وہ بوجھ بارے ذرا کم ہوا

قاضی سلیم

سنجوگ

اور سیلاب تھمتے ہی۔
شرمیلی دلہن کی طرح ندی نے
کناروں سے آہستہ آہستہ گھونگھٹ ہٹایا
وہیں پاس ہی ایک پتھر تھا یوگی کی مانند آسن جمائے ہوئے
ندی اک ذرا دیر ٹھٹکی
جھجک کر کہا ـــــ

"آج ایسے میں جب آتما میری عریاں ہے
تم کون ہو؟ جو یہاں رک گئے
سبھی سطح پر موج اڑاتے ہوئے جا رہے ہیں
تمہیں کیا
تہہ آب آیا ہے
بتاؤ کہ اس جرم کی کیا سزا ہے"

"وہ دیکھو ہر اک لہر جو بھی ادھر سے گذرتی ہے
ہنستی ہے، زہریلی باتوں کے الجھے بھنور میں
پھنسا کر مجھے پوچھتی ہے ـــــ سکھی
ترے آنچل کے پیچھے بھلا کون ہے

وقت کے تیز دھاروں سے کٹ کر یہاں
تیری پوجا میں مصروف ہے"——

اوک کے پیڑ کانپے
صنوبر نے بن کی ہواؤں سے سرگوشیاں کیں
ہرن کی قطاریں
پرندوں کی ڈاریں بھی پوچھنے آئیں۔
اُونچے پہاڑوں نے وہ بات دُہرائی جس سے
گھنی وادیاں خوف اور یاپ سے پٹ گئیں
"میں تو گھبرا گئی
اُٹھو میرے سادھو
اُٹھو دھیان کے سرد پاتال سے
میں تو گھبرا گئی"——
یہ سُن کر جو یوگی نے پلکیں اُٹھائیں
تو پھر وہ ندی تھی نہ پتھر نہ لہریں
فقط ایک میں تھا
ہمالہ کی بیٹی تھی
اور وہ مدن تھا
(جسے شیو نے اپنے ہاتھوں سے خود ہی جلا کر بھسم کر دیا تھا)
مگر آج پھر بان پھولوں کی لے کر
اشوکا کے اونچے درختوں کے پیچھے
اسی طرح چھپ کر کھڑا تھا——

—•—•—•—

باقر مہدی

"پاگل"

"—— میں ایسے گھر میں رہتا تھا
جس میں دروازہ بھی نہ تھا
خاموشی، وحشت بھی نہ تھی،
تنہائی دستک دے دے کر تھک سی گئی تھی،
مدّت سے آواز نہ آئی کانوں میں
میرا نطق یہ بھول گیا تھا اس کا بھی کچھ حق ہے زباں پہ
دل تو دھڑکتا تھا لیکن
اس کو میری چاہ نہ تھی ——"

"—— گھر میں یوں سب ہی رہتے تھے
اتنے پیار سے مجھ سے ملتے
جیسے میں بیگانہ ہوں
وہ اک دن کا مہماں ہوں ——"

"—— روز صبح وہ جاگ کے کہتے!

"نیند سے بہتر اس دنیا میں کیا رکھا ہے"
میں چپ چاپ یہ سنتا رہتا
کیا کہتا ــــ!
خوابوں سے وہ لوگ ابھی واقف ہی نہ تھے
ان کے کپڑے عجب طرح کے،
سر سے پا تک
رنگ برنگی جیبیں لٹکی
دُنیا کے بازار میں وہ سب ایسے بھاگ کے جاتے تھے
جیسے ان کے جیون کا نیلام اُٹھا ہو ــــ"

"ــــ شائد ان کا دل بھی ــــ
میں نے جیسے ہی یہ سوچا
رات گئے
چھپ کر میں نے آگ لگا دی
پھر کیا تھا
سب دروازے شور مچاتے کھلنے لگے
میں یہ دیکھ کے خوب ہنسا
کوئی بھی دیوار نہ تھی
دروازوں کا سارا مکاں تھا

میرے ساتھی دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئے
وحشت کا جل بن کر آئی
تنہائی نے دل میں آکر جشن منایا
بازاروں کا شور مرے کانوں میں گونجا
میری زباں مدّت کی ترسی — بول اٹھی
"آگ سے دروازے کھُلتے ہیں
رنگ برنگی جیبوں والے
بندر بن کر بھاگ گئے"
لیکن اتنا کہہ کر میں نے غور سے دیکھا
خون ٹپکتی جیبوں کا
میرے چاروں اُور تھا گھیرا
میں گھبرا کر زور سے چیخا، بھاگا
آج تلک میں بھاگ رہا ہوں —"

مجھ سے یہ باتیں کرتا تھا
طوفانی موجوں کے پاس
جو ہو کے ساحل پہ بیٹھا
میں نے اس کو چھونا چاہا
لیکن وہ میرا سایا تھا

خلیل الرحمٰن اعظمی

تنہائی سے آگے

اور یہ سب بحثیں جو گھس پٹ کے پرانی ہو جائیں
جب کوئی رس نہ ہو دہرائی ہوئی باتوں میں
مضمحل روحیں خموشی کا سہارا ڈھونڈیں
جب کوئی لطف نہ رہ جائے ملاقاتوں میں
جب نہ محسوس ہو کچھ گرمیٔ آداب و سلام
جی نہ چاہے کہ کبھی پرسشِ احوال کرو
دور تک پھیلی ہوئی دھند ہوں سنّاٹے ہوں
سب کے سب بیٹھے ہوں اور کوئی نہ ہو کچھ بھی نہ ہو
ان خلاؤں سے نکل کر کہیں پرواز کریں
آؤ اب سیر کریں ذہن کی پہنائی میں
کیوں نہ دریافت کریں ایسی گزرگاہوں کو
بات کرتی ہوں مسافر سے جو تنہائی میں
جان پہچان کے کچھ لوگ وہاں نکلیں گے
کوئی ایسا کہ جسے دیکھ کے ہم یہ سوچیں
یہ خد و خال یہ چہرہ تو ہے مانوس بہت
نام اب یاد نہیں، اس سے یہ کیسے پوچھیں

یا کبھی حافظہ دہرائے گا ایسا اک نام
دل کہے گا کہ یہ تھا اپنا ہی ملنے والا
اس کی صورت مگر اب ٹھیک سے کچھ یاد نہیں
سوچتے ہی رہیں وہ کیسا تھا، وہ کیسا تھا

رضا ہمدانی

اُلجھن

۲

حال کا حال زار نہ پوچھو
حال بحال نہیں رہتا ہے
یہ بے حال بنا دیتا ہے
اس کا گھر آباد نہیں ہے
اس کی کچھ بنیاد نہیں ہے
رہ چلتے کا سپنا ہے یہ
نہ میرا نہ اپنا ہے یہ

۳

کل تک ماضی اپنا ہی تھا
آج پرایا دھن ہے ماضی
ماضی اک بے رنگ فسانہ
پھیکی سی بے نور کہانی
جیسے ڈوبا ڈوبا سورج
جیسے کجلایا سا چاند
سُونا پنگھٹ خالی ناند

بہتا پانی سُوکھی ندی
پوہ ماگھ کی پورنماشی
بن دیکھے ہی بیت گئی

۴

مستقبل اَن دیکھا خواب
مستقبل گونگے کی بات
جاڑوں میں یا دور کی آگ
اَن دیکھی دُلہن ہو جیسے
کون ہو، کیسی ہو کیا جانے؟
دُور کے ڈھول سہانے

محمود دواہی

ظہیر کاشمیری

سلطانۂ جمال

سلطانۂ جمال میرے غم کدے میں آ
اک لمحۂ وصال کا دریوزہ گر ہوں میں
مدت سے مجھ کو قریۂ گل کی تلاش ہے
اب کیا ہوئیں وہ تیرے تبسم کی شوخیاں،
ہے اب بھی یاد تیرے تنفّس کی سرد آنچ
کیا تجھ کو اپنا دائرہ رقص یاد ہے
وہ مشکبو خطوط سہیلی کی معرفت،
وقتِ ورودِ ناز تیری چھاگلوں کا شور،
وہ سُرخ شال اور وہ گوری کلائیاں
وقتِ سلام وہ تیری گردن کا نیم خم،
شکووں کے سلسلے کہ سحر تک چلے گئے
انکارِ عشق اور وہ کب؟ کیا؟ کے روپ میں
رخصت کے وقت وہ تیرے ہونٹوں پہ آہِ سرد
مجھ کو یقین ہے ترکِ تعلق کے باوجود
تو ماضیٔ جمیل کی یادوں میں ہے اسیر
میں جانتا ہوں اے میری معبودہ حسیں

اے یارِ کج کلاہ، نقابِ نظر اٹھا،
بلقیس شہر، زریں کمر، رونق سبا
اے نے نوازِ موسمِ گل، پیکرِ صبا،
اب کیوں میں التفات کے قابل نہیں رہا
ہے یاد اب بھی شامِ شبستاں کا ماجرا
کیا میں تیرے شباب کا مرکز نہیں رہا
ہر ایک لفظ اپنی جگہ بولتا ہوا،،
صوفے پہ بیٹھ کر وہ مجھے دیکھنا تیرا،
وہ عارضوں پہ کشمکش گیسو و صبا،
جیسے نہال زورِ صبا سے جھکا ہوا
وہ رتجگے، کہ رات کا دل بولتا رہا،
اقرارِ عشق اور وہ چہرہ جھکا ہوا۔
مڑ مڑ کے شبکدے کی طرف دیکھنا تیرا
میں ہوں تیرے خیال کی رونق بنا ہوا،
آتی ہے اب بھی تجھ کو گئے دور کی صدا
اب بھی ہے تیرے دل میں مرا بت بنا ہوا

مجھ کو یقین ہے تیرا تلوّن مآل کار
مجھ کو ملے گا میرا پتہ پوچھتا ہوا"

شفیق فاطمہ شعریٰ

دلق پوش

تم اک حقیقت ایک خواب
پاس پاس دور دور
شاہراہ پرندی کے پار
اک شگونِ نیک کی طرح دکھائی دیتے ہو سدا

ریاضتوں نے عرق عرق کر دیا
ڈھلی ڈھلی نگاہ کی نقاہتوں میں خوابناک غم ہے کیا
بتاؤ دلق پوش اس کا کیف و کم
نمودِ وقت کے ہر ایک نظم کو جھنجھوڑ کر
وہ تہہ نشین نشہ جو تم پہ چھا گیا
بتاؤ دلق پوش اس کا کیف و کم

جو تم دریچہ بن سکو
جو تم سے سیلِ نطق پھٹ پڑے

نمودِ وقت کے ہر ایک نظم کو جھنجھوڑ کر
وہ سب میں جذب ہو سکے
تو ہر کوئی خود اپنی تھاہ میں کچھ ایسے ڈوب جائے جیسے تم

ہمیں بھی آج اوک سے پلاؤ جام سے نہیں

کہ ہم کو رہگذار کی مسافتوں نے ڈس لیا
ذرا سی اوس پنکھڑی پہ جذب ہو سکی نہیں
کہ ہم نے اس کو نغمۂ صبا میں عام کر دیا
گہر نصیب !
حیاتِ جبینِ صدف کو دیکھ کر
طمانیت سے یوں نہ مسکراؤ تم ۔ نمودِ وقت کے ہر ایک نظم میں بکھر کے سب
حقیقتیں ہماری خواب بن گئیں
نمودِ وقت کے ہر ایک نظم کو جھنجھوڑ کر تمہارے خواب بھی ہیں اصلیت نشیں
گہر نصیب !
وہ جن کے زلزلوں سے غم کی تھاہ گونجتی رہی
وہ جن کا کرب تحت و فوق و چار سو سے رس کے غم میں ڈوبتا رہا
وہ باتیں سب بہ پاسِ راہ و رسمِ زندگی
پتنگ کے رنگ حرف و صوت پہ تقسیم ہو گئیں عدیم ہو گئیں۔
گہر نصیب کتنے نارسا ہیں ہم

جو پاسِ دائمی کے نقش روح میں نظر میں دل میں گڑ گئے سو گڑ گئے
اب ان کو چھیڑنے کا بھی حوصلہ نہیں
کہ چین بھی لیں تو روح کو نظر کو دل کو کیا کریں
کہ یہ سدا کے زخم سنسناہٹوں میں درد کی ٹھٹھر کے سو گئے رہتے
پھر نہ ہوں ہرے کہیں

بسانِ خضر ہاتھ تھام لو
بسانِ خضر ہاتھ تھام کر لیے چلو
ہمیں نہ کچھ بھی پوچھنے دو
خود نہ کچھ جواب دو

کربچہ
کاہی نیلی لہروں سے جھلکتا اور چمکتا بحر
ایک بول ہے بھرا پُرا

اگر یہ اپنے جوشِ بے جواز سے
دھنک کے ساحلوں کو روئی کی طرح بکھیرتا ہوا
اتھاہ چپ کی سرد راکھ اُڑاتی وادیوں میں ڈوب کر اُبل پڑے
کنارتا کنار ان کو پاٹ دے

اگر بھرا پُرا وہ بول جو طلوع تھا شروع تھا
زیاں تھا جس کا جانِ پاک کا زیاں
کبھی ہمارے صبر کی سِلوں کو توڑ کر مچل پڑے
تو پھر وہی فراق ہو
تمھارے اور ہمارے درمیان

عزیز قیسی

صدائے گنبدِ بے روزن و در

کیسی آواز ہے ؟

کوئی کہتا ہے :

" یہ دشتِ موجود و مشہود و موہوم بس حدِّ ادراک و احساس و آواز تک ہی نہیں "

"چشم و دل کا یہ طائر جسے

سیرِ پرواز سمجھے ہو مجبور ہے

مشتِ پر سر بریدہ و پابند ہی اس کا سرمایہ ہے جس پہ مغرور ہے

تا بہ حدِّ خرد تا بہ حدِّ جنوں

جو بھی ہے ہیچ و بے مایہ ہے

کیا غرض ہے اس سے

یہ کیا ہے ؟ کیسا ہے ؟ کب سے ہے ؟ کب تک رہے گا ؟

اسے بھول جاؤ کہ تم خود حریفِ خداوندِ آفاق ہو

ان سوالات میں خود تمہاری ہی توہین ہے

تم دلِ عرش آثار کا آئینہ لے کے آئے ہو

جس میں کئی رنگ کی '

تیز رو، سست رو، شوخ، مدّھم، ہمجل، مستقل منفعل متّصل منتشر
منقسم، سادہ، پیچیدہ، مبہم، گراں و سبک، نیک و نحوس
موجود و مشہود و موہوم پرچھائیاں
یوں گزرتی ہیں جیسے کوئی دھیرے دھیرے سے پلکوں کو چھوتا رہے خواب میں
کون ہے کون ہے ؟

ماورائے خرد، ماورائے جنوں
ماورائے نظر، ماورائے نفس
منتظر، مضطرب اپنی صورت دکھانے کو بے چین ہے
کیسی آواز ہے جو ازل سے تعاقب میں ہے
میرے لہجے کا ایکان اس کے تخاطب میں ہے
یہ کہیں مری آواز ہی تو نہیں
میں مجھی کو صدا دے رہا ہوں بڑی دور سے — بڑی دیر سے
میں ہی اپنا حریفِ ازل
میں ہی اپنا حریفِ ابد
مجھ کو میرا پتہ دو کہ میں، اپنی آواز کی گونج ہوں

شاد امرتسری

پربت گیان

بھرے جنگل میں ایک پُل ہے
کہ جس کے شبنمیں پیکر کے نیچے سے کئی دریا گزرتے ہیں
یہ دریا پُل سے بس کچھ دُور ہی آپس میں ملتے ہیں
مگر اس پُل کے نیچے سے بس اک دریا گزرتا ہے
کئی دریاؤں کا دریا
کہ جس کا گدلا گدلا سُست رو پانی
تماشا کرنے والوں کو اجازت ہی نہیں دیتا
کہ پُل پر سے گزر جائیں

●

خدا جانے یہ پُل کس نے بنایا تھا
کہ اس کا شبنمیں پیکر ابھی تک شبنمیں ہی ہے
بہت کم لوگ اِس پر سے گزرتے ہیں
مگر جو بھی گزرتا ہے
وہ پُل پر سے گزر کر اک نئی وادی کو جاتا ہے
وہ وادی جس میں دُکھ اور سُکھ کے سائے چھائے رہتے ہیں
وہ وادی جس میں درد و کیف دونوں ساتھ بستے ہیں۔
وہ وادی اک نئی وادی ہے جس کو پانے والا بھی
حواس و ہوش کھو کر اک نیا انسان بنتا ہے۔

"طویل تلخ شیریں دیوانگی"

سارتر سے

ایک انٹرویو

سارتر: میری خود نوشت سوانح میں واقعات کی تاریخوں میں تضاد ہے، نقاد اُن پر زور دینے میں حق بجانب ہیں، ان کی بھی وجہ ہے کتاب کا بیشتر حصہ ۱۹۵۴ء میں لکھا گیا تھا۔ دس برس بعد چھپنے سے پیشتر اس میں قطع و برید اور ترمیم بھی کی گئی۔ اور میں نے تاریخوں کو ہم آہنگ (CO-ORDINATE) نہیں کیا تھا۔

آپ نے لکھا ہے: "دس برس تک میری کیفیت اس آدمی کی سی رہی جو طویل، تلخ، شیریں، دیوانگی سے بیدار ہو رہا ہو۔ کیا اس تبدیلی کو ۱۹۵۴ء ہی سے صورت پذیر تصور کیا جانا چاہیئے؟

سارتر: ہاں! اس وقت سیاسی واقعات کی بنا پر کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ میرے تعلقات بہت گہرے تھے۔ عمل کے ماحول میں آ کر میں نے اچانک محسوس کیا کہ میری پچھلی تخلیقات ایک قسم کے خلل اعصاب کی شکار تھیں۔ اس سے پہلے مجھے اس کی کبھی احساس نہ ہوا تھا۔ میں اپنا مرکز آپ تھا۔ مجھ سے پیشتر سائمون دی بیووائر نے ان وجوہات کا اندازہ لگایا تھا۔ ہر اعصابی مریض کی یہ خوبی ہے، کہ وہ اپنے اس جذبے کو قدرتی جذبہ سمجھ کر پیش کرتا ہے۔ میں بڑے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھے رہا، کہ میں لکھنے کے لئے پیدا ہوا ہوں، مجھے اپنے وجود کی ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہے اور میں ادب کو مطلق و کامل سمجھنے لگا تھا۔ اس ذہنی کیفیت سے چھٹکارا

پانے میں مجھے تیس برس لگ گئے۔ کمیونسٹ پارٹی سے تعلقات قائم ہونے پر جب مجھے میرا مطلوبہ (مطمحِ) نظریہ ملا، تو میں نے اپنی سوانح عمری لکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں یہ دکھانا چاہتا تھا کہ کس طرح ایک آدمی ادب کے تبرکات سے نکل کر عمل کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور جو ہر صورت ایک انٹلیکچوئل کا عمل رہتا ہے"

اپنی سوانح عمری کے اس حصے میں نے اپنی دیوانگی، اپنی اعصابی بیماری کا جو ذکر کیا ہے، یہ اُن نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ہو سکتا ہے، جو لکھنے کے خواب دیکھتے ہیں، تاہم یہ خواہش قدرے عجیب سی ہے۔ اور "دیوانگی" کے شائبہ سے پاک نہیں۔ وہ نوجوان جو مکے بازی میں چیمپئن یا امیر البحر بننے کے خواب دیکھتا ہے، حقیقت پسند ہے۔ لیکن اگر قلم کار "تخیئلی" بننا چاہتا ہے تو تو وہ دونوں کو گڈمڈ کر دیتا ہے۔

س: آپ کی اِس تخلیق کو پڑھنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہونچے گا کہ ادب کا انتخاب آپ کو مجبوراً کرنا پڑا اور آپ کو اس کا بڑا افسوس ہے۔

سارتر: اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۵۴ء میں مجھے قدرے افسوس ہونے لگا تھا۔ میں کسی اور دنیا میں نو آموز تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں پچاس برس تک جیوں گا (اس وقت میں تقریباً انسٹھ برس کا ہوں) لیکن ملاحظہ فرمائیے، میری اس کتاب میں دو لہجے کارفرما ہیں، --- اس تعزیہ کی بازگشت اور شدت کا اندمال --- اگر میں نے اپنی سوانح جلد اور اصلی روپ میں شائع نہیں کی تھی۔ تو اس لئے کہ میں اسے مبالغہ سمجھتا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کسی بچارے کو محض اس لئے خوار کریں کہ وہ لکھتا ہے اسی اثنا میں مجھے اس بات کا بھی احساس ہو گیا تھا کہ عمل میں بھی دشواریاں ہوتی ہیں۔ اور عصبی تغیر کے سبب بھی کوئی ان سے دوچار ہو سکتا ہے۔ ادب کیطرح سیاست بھی ہمیں بچا نہیں سکتی۔

س: ہمیں کیا بچا سکتا ہے؟

سارتر: کچھ بھی نہیں۔ چھٹکارا کسی طرح بھی نہیں۔ چھٹکارا کا خیال مطلق و کل کا خیال ہے۔ چالیس برس تک میں اس جذبۂ مطلق یعنی عصبی تغیر کا شکار رہا۔ اب وہ جذبہ تو نہیں رہا۔ لیکن اب کرنے کو بہت سے کام ہیں۔ اور ادب کسی بھی نقطۂ نظر سے ایسا نہیں کہ اس پر زیادہ توجہ صرف کی جائے۔ اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ "اب مجھے معلوم نہیں کہ اپنی زندگی کا کیا کروں" تو قارئین کو میری اس بات کو میرے اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ نقادوں کو میرے اس بیان میں سیمون ڈی بیوار کے فقرے --- مجھ سے دھوکا ہوا ہے --- کی

صدائے مایوسی کی بازگشت سنائی دی ہے، ان کی قیاس آرائی غلط ہے۔ جب سیمون نے یہ کہا تھا، تو اس کا مطلب تھا کہ وہ زندگی سے کسی ایسے کلیہ کا تقاضا کرتی ہے۔ جو وہاں ہے ہی نہیں۔ میرا ابھی یہی نظریہ ہے۔ میں اس کی نسبت زیادہ مایوس نہیں دیگر میں ہمیشہ رجائیت پسند رہا ہوں اور شاید حد سے زیادہ ہی۔ ۔ ۔ ۔

س: لیکن وہ ماحول جو آپ کے ناول گھن (LA NAUSEE) میں ملتا ہے، بہ مشکل رجائی ہے، کیا اب آپ نے زندگی کو اُس انداز سے دیکھنا بند کر دیا ہے۔

سارتر: نہیں تو۔ دنیا میں تاریکی اب بھی ہے۔ ہم وہ مخلوق ہیں جن پر مصیبت نازل ہوئی ہے، .... لیکن اس اجنبیت، انسان سے انسان کے استحصال، غذائیت کو پس منظر کی اس مابعد الطبیعاتی برائی کے ذمہ ڈال دیا گیا ہے، جسے عیاشی کہتے ہیں، .... یہ انکشاف مجھ پر اچانک ہوا۔ بھوک ایک برائی (دور) ہے، ایک سوویت شہری نے جو سرکاری قلم کار ہے، ایک بار مجھ سے کہا تھا: "جس دن کمیونزم (یعنی ہر فرد کی بہبودی) کا دور دورہ ہوگا، اس دن انسان کے المیہ کا آغاز ہوگا اس کی منتہا۔" اس کے انکشاف کا ابھی وقت نہیں۔ میرا ایمان ہے، میری خواہش ہے کہ سماجی اور اقتصادی برائیوں کا ازالہ ہونا چاہیئے۔ اگر قسمت تھوڑا سا بھی ساتھ دے، تو وہ دور آ سکتا ہے۔ میں اُن لوگوں کا ہم خیال ہوں، جو یہ سوچتے ہیں کہ جب دنیا بدل جائے گی، تو حالات بہتر ہو جائیں گے۔

س: تو آپ بیکیٹ (BECKETT) کے ملعون جہان کو قبول نہیں کرتے؟

سارتر: میں بیکیٹ کا مداح ہوں، لیکن مکمل طور پر اس کا مخالف بھی۔ وہ کسی بھی بہتری کا خواہاں نہیں۔ جہاں تک میری قنوطیت کا تعلق ہے، وہ اخلاقیات سے عاری نہیں۔ اُس زمانے میں بھی جب میں نے گھن (LA NAUSEE) لکھا تھا، میں ایک اخلاقیات کی بنیاد اٹھانا چاہتا تھا۔ اب میں LES NOURITURES TERRESTES کو ایک بھیانک تخلیق سمجھتا ہوں۔ .... "خدا کو اور کہیں نہیں، بلکہ ہر جگہ دیکھو۔" جاؤ، محنت کش مزدور، ہر انجینئر کو یہ بتا دو۔" .. یہ بات ژید (GIDE) مجھ سے کہہ سکتا ہے۔" یہ تو قلم کار کا اخلاقی نظریہ ہے، جو چند منتخب لوگوں کے لئے مخصوص ہو سکتا ہے، اس لئے، اس میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اول تو یہ کہ سبھی

بشر اس قابل ہونے چاہئیں، کہ وہ زندگی کے حالات کو بہتر بنا کر انسان بن سکیں، تاکہ آفاقی اخلاقیات جنم لے سکے۔ اگر میں آغاز یوں کروں۔ "تم جھوٹ مت بولنا"! تو سیاسی عمل کے لئے فی الواقع کوئی امکان نہیں رہ جاتا۔ سب سے اہم بات تو آدمی کی آزادی ہے۔

س: کیا اس نظریے سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ آپ اپنی پچھلی تخلیقات سے دست کش ہو رہے ہیں؟

سارتر: قطعی نہیں۔ اس ضمن میں جو کچھ بھی میں نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے، لوگوں نے اس کا غلط مطلب نکالا ہے۔ میں اپنی کسی بھی کتاب سے دست کش نہیں ہوا۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ میں انھیں اچھا سمجھتا ہوں، اپنے ناول گھن (LA NAUSEE) کے بارے میں مجھے جس بات کا افسوس ہے وہ یہ نہیں کہ میں نے خود کو مکمل طور پر اس میں رکھ دیا ہے۔ میں تو اپنے فساد اعصاب کے سہارے ناول کے ہیرو کی بیماری سے آزاد رہا۔ ناول لکھتے وقت یہ احساس میری خوشی کا سبب تھا۔۔۔ میں ہمیشہ خوش رہا ہوں۔ اگر اس وقت میں اپنے بارے میں زیادہ دیانت دار ہوتا، تو بھی "گھن" ضرور لکھتا۔ اس وقت جس شے کا مجھ میں فقدان تھا، وہ حقیقت کا احساس تھا، تب سے میں بہت بدل گیا ہوں، آہستہ آہستہ میں نے حقیقت کا تجربہ کرنا سیکھ لیا ہے، میں نے بچوں کو فاقوں سے مرتے دیکھا ہے، اور میرا ناول "گھن" مرتے ہوتے بچوں کی موت کا توڑ تو نہیں ہو سکتا۔

س: کیسی تخلیق اس کا توڑ ہو سکتی ہے؟

سارتر: قلم کار کو واقعی یہی مسئلہ درپیش ہے، دنیا میں جب لوگ بھوکے ہوں تو ادب کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اخلاقیات کی طرح ادب کو بھی آفاقی (کون ومکان کی پابندی سے آزاد) ہونا چاہیئے، تاکہ وہ فاقوں کی شکار دو کھرب اکثریت کا ساتھ دے سکے۔ اور اگر وہ چاہتا ہے کہ وہ تمام انسانوں سے ہم کلام ہو سکے اور وہ تمام اس کی تخلیقات پڑھ سکیں، تو قلم کار کو دو کھرب فاقہ زدہ لوگوں پر مشتمل اکثریت کا ساتھ دینا چاہیئے، بصورت دیگر وہ مراعات یافتہ طبقے کا خادم ہوگا، اور اس لحاظ سے وہ استحصال کرنے والوں کی صف میں شامل ہوگا قلم کار کے پاس عوام کو جاننے کے دو طریقے ہیں، اوّل یہ کہ کچھ عرصہ کے لئے اسے لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی خاطر ادب کو ذہنیت طاق نسیاں بنا دینا چاہیئے، روسی ادبا نے اس نظریہ کو لبیک کہا ہے۔ ایسے ممالک کا کوئی باشندہ، جہاں راہبروں کی کمی ہے (جیسا کہ افریقہ میں) یوروپ میں تعلیم حاصل کرنے بعد

اپنی ادبی سرگرمیوں کی قیمت پر بھی پروفیسری اختیار کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے؟ اگر وہ یوروپ میں رہ کر ناول لکھنا بہتر سمجھتا ہے، تو میری نگاہ میں وہ کسی غدار سے کم نہیں ظاہری تضاد کے، باوجود بنی نوع انسان کی خدمت سرانجام دینے اور ادب کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

دوسرا طریقہ جو ہمارے غیر انقلابی سماج پر لاگو ہوتا ہے، یہ ہے کہ ایسے وقت کے لیے تیاری کی جائے، جب ہر کوئی پڑھنے کے قابل ہوگا، اس کے لئے مسائل کو نہایت انتہاپسندانہ طریقے سے پیش کرنا ہوگا۔ آلیں بادی او (ALAIN BADIOU) نے آل ماذیس تے (ALMAGESTES) میں یہی کہا ہے؛ اس کتاب میں جب زبان کو پاک کرنے کے مقصد کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔

س: کیا یہ کتاب سبھی پڑھ سکتے ہیں؟

سارتر: محتاط رہیئے، میں ایسے "مقبول" ادب کی سفارش نہیں کر رہا ہوں، جسکا مطمحٔ نظر نہایت ادنیٰ ہو، عوام کو بھی ایسے مصنف کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے، جو کہ آسودہ خاطر الہام کو ترک کرنے کے باوجود اپنے نئے مضمر خیالات کو ہمیشہ وضاحت اور مروجہ انداز میں پیش نہیں کرسکتا۔ اب میلارمے ہی کو لیجئے، میں اسے فرانس کے عظیم شعرا میں شمار کرتا ہوں حالانکہ مجھے اسے سمجھنے میں کافی وقت لگا ہے، میں اس کے بعید از قیاس ہونے کے نظریے کو غلط سمجھتا ہوں۔ اسے سمجھنا اس وقت مشکل ہوتا ہے، جب وہ گنجلک مسائل کی باتیں کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیئے کہ لوگ صرف وہی تخلیقات پڑھنا چاہتے ہیں جس میں آسانی کے ساتھ کھویا جاسکتا ہو، پاکٹ بک سیریز کا تجربہ اس کا واضح ثبوت پیش کرتا ہے جب سے میری کتابیں ان سیریز میں چھپنے لگی ہیں، میرے پڑھنے والے بدل گئے ہیں، اب مجھے مزدوروں، سکریٹریوں وغیرہ کے خطوط آتے رہتے ہیں۔ وہ بہت ہی دلچسپ خطوط ہوتے ہیں۔

س: مختصراً، آپ کی خواہش کے مطابق مصنف اور قاری کی ملاقات، اتنی وسیع ہونی چاہیئے کہ ادب بالآخر اپنی صداقت کو پالے۔ اسی میں طرفین کی فتح ہے۔

سارتر: یہ تو ایک لڑائی ہے، جسے لڑنا ہی ہوگا، جب تک قلم کار ۲ کھرب فاقہ زدہ لوگوں کے لئے نہیں لکھ سکتا وہ ایک اضطرار و اضطراب کا شکار رہے گا۔

س: تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ قلم کار مظلوم لوگوں کے لئے ہی لکھے ؟

سارتر: ہاں ! لیکن یہ تو قلم کار کا کام ہے ۔ اور اگر وہ اسے سرانجام دیتا ہے، جیسا کہ اسے دینا چاہیئے تو اُسے اس کے لئے کسی انعام واکرام کی ضرورت نہیں، قلم کا تصرف بہادری کا تمغہ حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوتا ۔

قلم کار سے میں یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ حقیقت اور پیش نظر اہم مسائل سے بے رُخی نہ برتے. میں حیران ہوں کہ دنیا کے فاقہ زدہ لوگوں، ایٹمی خطرات اور انسان سے اجنبیت جیسے اہم مسائل ادب میں نظر نہیں آتے، کیا آپ کا خیال ہے کہ میں روب گریلے (ROBBE GRILLET) جیسے مصنف کو کسی غیر ترقی یافتہ ملک میں پڑھ سکتا ہوں، روب اپنے تئیں بے وست دپا محسوس نہیں کرتا ۔ وہ ایک اچھا مصنف ہے، لیکن وہ تو آرام کی زندگی بسر کرنے والے بورژ والوگوں سے باتیں کرتا ہے، کاش وہ سمجھے کہ گنی بھی اس دنیا میں ہے، گنی میں میں کافکا پڑھ سکتا ہوں، میں نے اس میں اپنے ذاتی اضطرار کی جھلک پائی ہے. آل مازیس تے (ALMAGESTES) بھی اس زمرے میں آتا ہے، کیونکہ وہ زبان کے ذریعے ہماری دنیا کا امتحان لے رہا ہے ۔ یاد رکھیئے کہ اس دور کے قلم کاروں کو اپنی بے چینی کے احساسات کی وضاحت کرتے ہوئے ہی لکھنا چاہیئے، تب وہ ایسے بیکیٹ (BACKETT) ہوں گے جو نا اُمیدی کی شکار نہیں ہوں گے ۔

میں ہئیت کو خواہ وہ کلاسیکی ہو یا کوئی اور غیر اہم سمجھتا ہوں ۔ انداز بیان ٹالسٹائی کی جنگ وامن کا ہو، یا آل ۔ ازیس تے کا، سبھی ہئیتیں تسلی بخش ہو سکتی ہیں۔ کسی تخلیق کا پہلا معیار یہ ہے کہ وہ قرین قیاس ہو، دوم، وہ دل و دماغ پر اثر کرے سوئم آفاقی بھی ہو ۔

س: کیا آپ اپنی سوانح عمری لکھنا جاری رکھیں گے ؟

سارتر: یقیناً، لیکن فوری نہیں، سردست میں فلا بیئر کی سوانح مکمل کر رہا ہوں ۔

س: یہ فلا بیئر کیوں ؟

سارتر: کیونکہ وہ میرا دوسرا رُخ ہے ۔ بشر کو بحث میں ضرور الجھنا چاہیئے، میں نے اپنی سوانح میں ایک جگہ لکھا ہے" میں نے اکثر اپنی ذات کے خلاف سوچا ہے" لوگوں نے یہ جملہ بھی نہیں سمجھا، نقادوں نے اس میں میرے اذیت پسندی کے اعتراف کی جھلک

باقی صفحہ ۱۱۵ پر

سارتر کی خود نوشت سوانح حیات

"الفاظ"

امریکی تبصرہ نگار کی کسوٹی پر

جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کی جب انٹیلیکچوئل تاریخ قلم بند کی جائے گی، تو ژین پال سارتر کا نام اس کا مرکز دمحور ہوگا۔ فلسفی، ڈرامہ نویس، ناول نگار اور سیاسی عقائد باف سارتر نے عصری نظریہ کو تشکیل دینے میں جو کچھ کیا ہے، شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ اس نے یہ کام اپنے خیالات کی قوت اور اثر سے براہِ راست اور دوسرے نظریوں کے سخت جان مخالف کی حیثیت سے سرانجام دیا ہے، سارتر کے بارے میں یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ سوالات جو اس نے اٹھائے ہیں، وہ دوسروں کے جوابات سے زیادہ کارآمد ہیں۔

جو سوال سارتر نے اپنی سوانح حیات "الفاظ" میں اٹھایا ہے وہ فن وفکر کے مزاج کو سمجھنے کے لئے اس قدر اہم اور بنیادی ہے، کہ عین ممکن ہے کہ یہ کتاب ہمارے زمانے میں "خود شناسی" میں سنگ میل قرار پائے، یہ مغالطہ پیدا کرنے کے انداز میں پیش کی گئی ہے، کیونکہ "الفاظ" سارتر کی خود نوشت سوانح ہے، جس میں اُس نے خودی کے آغاز، ماضی کے خوابوں کا بڑے دلکش پیرائے میں ذکر کیا ہے، لیکن سرگذشت کے بیان میں اس نے کسی لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیا، اور یہ فلسفے سے یکسر مختلف ہے، روسو، اور سینٹ آگسٹین کی سوانح عمریوں کی طرح یہ کتاب بھی، مصنف اور موقع کی حدود سے بالاتر ہو کر، ایک دور کے ذہن کا آئینہ اور ایک بشر کی اپنے وجود کے ساتھ پیہم جنگ

کی دستاویز بن جاتی ہے۔

حالانکہ جن واقعات میں سارتر کی دلچسپی ہے، وہ داخلی و باطنی ہیں وہ سوانح کی شروعات اپنے بچپن سے کرتا ہے لیکن یہ باب بھی روایتی سوانح عمریوں سے مختلف ہے، کیونکہ اس کی نثر کی خوبصورتی حیرت انگیز ہے، اور اس کے اقدار کا تعین بے حد پیچیدہ۔

سارتر کا جنم ۱۹۰۵ء میں پیرس میں ہوا، اس کی ماں البیر شویت زئیر کی رشتہ سے بہن تھی، وہ سادہ سی لڑکی تھی بیس برس کی عمر میں اس نے ایک نوجوان بحری افسر سے شادی کر لی۔ لیکن ژین پال کی پیدائش سے قبل ہی وہ خدا کو پیارا ہو گیا، اس سانحہ کے بارے میں سارتر کا ردعمل غیر روایتی ہے، وہ لکھتا ہے "اگر میرا باپ زندہ ہوتا تو مجھ پر اس طرح حاوی ہوتا کہ مجھے ختم کر دیتا" دوسرے لفظوں میں باپ کی شفقت سے محروم رہنے سے اسے خود کو بنانے میں آزادی مل گئی۔

جلد ہی یہ کتاب سارتر کے تشکیلِ خود کے عمل کی داستان بن جاتی ہے، اس کے نانا نے اس کی پرورش کی، وہ ایک مدرس تھا، سارتر کے لفظوں میں وہ "باپ خداوند سے اس قدر مشابہ تھا کہ اکثر میں اسے "وہی" سمجھتا تھا ایک لحاظ سے سارتر کی عادات بگاڑ دی گئی تھیں، چنانچہ اسے اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لگا، اور مبارک وقت تب آیا، جب اس کے نانا نے اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا تھا "اس کے پاس ادب کا ذخیرہ ہے" دراصل سارتر کی پیدائش اسی روز ہوئی تھی، سارتر خود لکھتا ہے "میں نے یوں اپنی زندگی شروع کی اور بلاشبہ یوں ہی اس کا خاتمہ ہوگا۔ یعنی کتابوں کی دنیا میں ـــ بہت چھوٹی عمر میں جب میری تربیت ہو رہی تھی۔ میں پڑھانے کو تبلیغی کام سا مقدس اور ادب کو ولولہ کا ہم معنی سمجھتا تھا"

لیکن جوں ہی وہ ادب کی جانب، الفاظ کے خواب کی اصلیت اور آغاز کی طرف راغب ہوا اسے ایک زبردست دھوکا ہوا "میں تقریباً کچھ بھی نہ تھا، بس زیادہ سے زیادہ بے مقصد عمل، لیکن فرور بھی تو یہی تھی، میں خود فریبی سے دور بھاگ رہا تھا، میں نے ابھی کام کرنا شروع نہیں کیا تھا، لیکن میں نے ریاکاری چھوڑ دیا تھا، جھوٹا اپنے جھوٹ کی وضاحت میں سچائی پا رہا تھا" دوسرے لفظوں میں اس نے کسی عقیدے کے تحت لکھنا شروع نہیں کیا تھا، وہ امر ہونا چاہتا تھا ـــ اور اس کے لئے وہ جو اندر سے خواہاں تھا ـــ (کیتھولک دھرم میں وہ یہ پا نہ سکا تھا ـــ مجھے ایک "خالق" کی ضرورت تھی اور مجھے ایک "حاکم" دے دیا گیا تھا ـــ اور جو کچھ اس نے لکھا اس کی صداقت کا اندازہ اس بات سے ہو

سکتا ہے کہ اس سے اس کی لگن کو کس درجہ تقویت ملی تھی۔

وہ خود سے بے وفا تھا۔ وہ خود کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے لکھنا شروع کیا، لیکن اسے کافی جان کنی کرنا پڑی، وہ خود اس کا اعتراف کرتا ہے، وہ اکثر غیر ذمہ دار اور بے لگام ہو جایا کرتا تھا، سارتر برابر کہتا آرہا ہے، آدمی اپنی تخلیق، خلا میں اپنی قدروں اور بوسیدہ نظریات کے مقابل اپنی وجودیت کے لئے خود ذمہ دار ہے، اسے ایسے خیالات پر شبہ ہو جاتا تھا، تاہم ان الفاظ نے تشکیک وشبہ کی تصدیق کر دی ہے، اور اب چونکہ یہ حقیقت ہے، تو یہ فکر و ادب کے بارے میں ہمارے ایقان کو کس طرح متاثر کرتا ہے اگر سارتر مخلص نہ تھا، تو پھر کو دک ادیبوں کی کیا بساط۔

اس ضمن میں اصلی سوال کا جواب آپ کو فرانس کے عظیم اور دنیا کے بے مثال فن کار "پکاسو" کے ایک فقرہ میں ملے گا۔ وہ لکھتا ہے "فن ایک دروغ ہے، جو راستے کی نشان دہی کرتا ہے" ممکن ہے یہ معرکہ خیز سوانح حیات ہم پر روشن کرے کہ فلسفہ اور ادب بھی ایک قسم کا جھوٹ ہیں، اور زیادہ سے زیادہ کسی حقیقت کے مشابہ فلسفی اور شاعر اپنی ضروریات کے مطابق ان حقائق کا تصرف کرتے ہیں، جو کبھی دنیا کے اصولوں کے مطابق کے نہیں ہوتے، اس لئے ہم فلسفیوں اور شاعروں سے زیادہ سے زیادہ اشاروں، تصورات، اور معنی خیز خاکوں ہی کی توقع کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کے وسط میں ایک جگہ سارتر لکھتا ہے "جو کچھ میں نے ابھی ابھی لکھا ہے جھوٹ ہے۔ سچ نہیں۔ پاگل آدمیوں، عام آدمیوں کے متعلق پھر لکھی ہوئی بات کی طرح نہ تو یہ سچ ہے اور نہ ہی جھوٹ ــــ"

(بقایا صفحہ ۱۱۲)

دکھائی دی ہے، تاہم ہر ایک بشر کو سوچنا اسی طرح چاہیئے ــــ اپنے اندر موجود جذبے کے خلاف بغاوت کرنی چاہیئے۔

س: تب تو اضطراب، آزمائش، مباحثے، بغاوت، حقیقت، آزادی . . . . یعنی آپ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی؟

سارتر: میں اس طرح بدلا ہوں، جس طرح استحکام کی حالت میں کوئی بدل سکتا ہے۔

(این کاؤنٹر کے شکریے کے ساتھ)

جمیل جالبی

نئے ادب کا مسئلہ

جب میں عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا خیال کرتا ہوں تو معاً مجھے اس بڑے سے غبارے کا دھیان آتا ہے جس کی ہوا نکل گئی ہے اور وہ میلی کچیلی دھجی کے مانند کسی بچے کے ہاتھ میں لٹک رہا ہو۔ اب اس غبارے کا استعمال صرف یہ ہے کہ بچے اپنے منہ سے چھوٹے چھوٹے غبارے بنائیں اور ہاتھ پر رکھ کر پٹاخ سے پھوڑیں تاکہ گھر والے چونک جائیں اور بچے مزا لیں۔ گذشتہ چار پانچ سال سے اردو ادب کے ادیب یہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اردو ادب کو دیکھئے تو فقرہ بازی کی ہوا سے ننھے ننھے غبارے بنا کر پٹاخ پٹاخ کی آوازوں سے سنسنی پھیلائی جا رہی ہے اور اس عمل کو نئے ادب کا نام دیا جا رہا ہے۔ ادب سے سنجیدگی غائب ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادیبوں کے سامنے فکر و ادب کا کوئی سنجیدہ مسئلہ باقی نہیں رہا ہے۔ ادیب کو آج یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ کس کے لئے لکھ رہا ہے اور کیا لکھ رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اب اس کے سامنے وہ دوسرے لکھنے والے ہیں جو ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے اس کی تحریریں پڑھتے اور ردعمل بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی لئے ادب سے متعلق جتنی تحریریں نظر آتی ہیں ان میں ایک ادیب دوسرے ادیب سے مخاطب ہے اور سنجیدہ مسائل کی جگہ ادبی سیاست نے لے لی ہے۔ ایسی بے ضرورت باتیں جو صرف قہوہ خانوں میں کی جاتی تھیں، عام طور پر ادبی رسالوں میں نظر آ رہی ہیں۔ شہرت کی خاطر عہد حاضر کے

ادیب نئی نئی شکلیں بنا کر سامنے آ رہے ہیں تاکہ ان کی عجیب و غریب شکلوں کو دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ وہ کام جو پہلے سڑک کے کنارے مجمع لگانے والے مداری کرتے تھے اب ڈگڈگی بجا کر ہمارے ادیب کر رہے ہیں۔ اسی کو دیکھ کر کچھ سنجیدہ ادیب، ادب کی موت کا اعلان کر کے خاموش ہو گئے ہیں — آخر جب یہی چیز ادب ٹھہرے تو ادب کے علاوہ کوئی اور مفید کام کیوں نہ کیا جائے۔ ادب پڑھنے کے بجائے کرکٹ میچ کی کومنٹری کیوں نہ سنی جائے۔ جاسوسی، فلمی رسالے کیوں نہ پڑھے جائیں اور تاش کے کھیل سے فرصت کا وقت کیوں نہ گزارا جائے؟ پہلے ادب اس لئے پڑھا جاتا تھا کہ معاشرہ ادب کے ذریعے خود کو تلاش کرتا تھا اور فرد ادب کے ذریعے خود کو تخلیق کرنے کا کام لیتا تھا۔ اسی لئے کتابیں خریدنا، کتابیں پڑھنا خوش مذاقی کی بات تھی۔ جب ادب انسانی فکر و شعور کو کچھ نہ دے رہا ہو تو آخر ادب کیوں پڑھا جائے۔ اب تک ادب کا کام شعوری طور سے بھی اور غیر شعوری طور سے بھی یہی رہا ہے کہ وہ زندگی سے خام مواد لے کر ایک ایسی دنیا تخلیق کرے جس کے معنی وا اقدار ایک طرف ادیب کے ادبی عمل تجربے کو دوام بخشیں اور دوسری طرف زندگی میں خیر کا اضافہ کر کے خود زندگی کو تازہ دم کر دے۔ لیکن یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب ادیب ادب سے سنجیدہ ہو اور زندگی سے اس کا پورا تعلق ہو۔ جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہے، جو کچھ معاشرے پر گزر رہی ہے، جو کچھ چھپی ہوئی خواہشات فرد کے اندر موجود ہیں نہ صرف ادیب ان سے واقف ہو بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہو یا کم از کم جاننے کے لئے بے چین ہو کہ آخر معاشرے نے زیادہ مقدار میں نیند کی گولیاں کیوں کھائی ہیں؟ آگاہی اور بصیرت کے اسی عمل کے ذریعے ادیبوں نے ہمیشہ احساس، جذبے اور فکر کو ایک ایسی شکل میں ایسی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے جو شکل اور ترتیب خود فطرت کے پاس بھی موجود نہیں تھی۔ سچا ادب ہمیشہ معاشرے کے ساتھ بھی چلا ہے اور اسے ساتھ لے کر بھی چلا ہے۔ اس کا اظہار بھی کیا ہے اور اسے بدلا بھی ہے۔ اب اس زاویے سے اس دور کے ادب کو دیکھئے تو یوں محسوس ہوگا کہ آگاہی و بصیرت کا عمل ہمارے ہاں بند ہو گیا ہے اور وہی ادب کامیاب ہے جو کثیر الاشاعت اخباروں کے مقبول کالموں کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ حیات و کائنات کے مسائل کا علاج صرف محض فقرے بازی کے تعویذ گنڈوں سے کیا جا رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمارے پاس سوچنے اور کہنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ ذہنی طور پر بیکاری محض کے اس ڈھا دینے والے احساس کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ ہماری نسل، اُس نسل کی جو زندہ تھی، صرف بھوت ہے۔

اس صورتِ حال کا شعور حاصل کر کے آپ مجھ سے یہ سوال پوچھنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب دراصل جدید ادب کا بنیادی مسئلہ ہے۔ لیکن ادب کا بنیادی مسئلہ ہونے کے باوجود اس کا جواب ادب میں تلاش کرنا گمراہی کا وہ عمل ہے جو ہمیں کہیں نہ پہنچا سکے گا۔ ایک ایسے دور میں جب ادب شعورِ انسانی کو کچھ نہ دے رہا ہو اور اس کی حیثیت صرف ہجو سی چو کر ہو کر رہ گئی ہو تخلیقی مسائل کو ادب میں تلاش کرنے کے بجائے خود زندگی اور معاشرتی نظام خیال و اقدار میں تلاش کرنا چاہیئے جن سے ہماری زندگی عبارت ہے۔ غور کیجئے کہ کیا ہمارے لئے زندگی میں اور زندگی کے کوئی معنی باقی رہ گئے ہیں؟ جب زندگی خود اس طرح بے معنویت کا شکار ہو گئی ہو؟ جب زندگی میں کوئی جہت اور کوئی مقصد باقی نہ رہا ہو تو آخر ادب میں کہاں اور کیسے معنی نظر آئیں گے ــــ زندگی کی یہی بے معنویت ہماری نسل کو تخلیقی سطح پر اندر گھن کی طرح کھا رہی ہے اور ہماری نسل کے ادیب برف کے تودوں کے پل بنا کر اپنی تخلیقی زندگی کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کیا یہ صورت بذاتِ خود تشویش ناک نہیں ہے؟

اگر ادب اور زندگی کے تعلق پر ہم ایمان رکھتے ہیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر معاشرہ زوال پذیر ہے، اگر معاشرے کے پاس اقدار و خیال کا صحت مند نظام باقی نہیں رہا ہے تو اس معاشرے کا ادب بھی بے جان ہو گا۔ اس لئے کہ ایک صحت مند معاشرے میں زندگی کی ہر سطح پر ادیب کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ ہمارا اپنا معاشرہ قدم قدم پر تضاد کے بحران میں مبتلا ہے۔ خیال و عمل میں کسی قسم کا ربط نہیں ہے۔ مروجہ اقدار اور تصورِ حقیقت پر ہم ایمان نہیں رکھتے۔ ہمارا نظامِ خیال اتنا کھوکھلا ہو چکا ہے کہ اب وہ تخلیقی عمل میں کسی قسم کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ آج تہذیبی و معاشرتی سطح پر اقدار و اخلاق کا کوئی ایسا زندہ نظام ہمارے پاس نہیں ہے جس پر ہم جثیت طریقہ سے زندگی کا کوئی نیا قلعہ تعمیر کر سکیں۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ منتشر ہے۔ چیزوں کے رشتے بکھر گئے ہیں۔ جمی جمائی اقدار ٹوٹ پھوٹ کر ایک ڈھیر کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ خیالات اور عقائد کا وہ نظام، جس پر صدیوں سے ہم یقین رکھتے چلے آئے تھے اور جو ایک تہذیبی اکائی کی حیثیت سے ہمارے شعور میں زندہ تھا، اب بے معنی اور از کار رفتہ نظر آنے لگا ہے۔ سارے معاشرے میں اب کوئی چیز اپنی اصلی شکل میں نظر نہیں آتی۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ اصل نہیں ہے اور جو چیز اصل ہے وہ نظر نہیں آتی۔ تضاد نے ساری زندگی کو گھیر لیا ہے اور عدم تحفظ کے احساس کو شدید تر بنا کر زندگی سے کام کرنے کی گرمجوشی ہی کو ختم کر دیا ہے

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جب معاشرہ اس درجہ بدحال ہو اور خود زندگی میں اہم واقعات پیش نہ آرہے ہوں تو آخر ادب میں کہاں سے آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نسل کے ادیب صرف خود کو دہرانے اور گلی سڑی ہڈیوں کو چوس چوس کر مزے کا احساس دلانے کا کام کر رہے ہیں۔ زندگی کی ہر سطح پر تخلیق کی آگ سرد پڑ گئی ہے اور خیال کا ارتقا بند ہو گیا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو اور معاشرتی و تہذیبی اقدار وقت کے ساتھ چلنے یا وقت کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہوں تو ادب میں معنی کہاں سے آئیں گے؟ آج کے ادب اور ادیب کا یہ بنیادی مسئلہ ہے۔

جب میں سوچتے سوچتے یہاں تک پہنچا تو ایک سوال میرے ضمیر میں کانٹے کی طرح کھٹکا کہ جب ادب کے زوال اور تخلیق کی آگ سرد پڑ جانے کے اسباب ہم معاشرے میں تلاش کر رہے ہیں تو آخر میر و سودا کا معاشرہ بھی تو زوال پذیر معاشرہ تھا۔ اس دور میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ اردو شاعری نے عظمت کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا۔ اگر معاشرے کی زوال پذیری ہمارے دور کے ادب کو بے جان اور بے معنی بنائے ہوئے ہے تو میر و سودا کے زوال پذیر معاشرے نے اپنے دور کے ادب کو بے جان کیوں نہیں بنایا؟ یہ یقیناً ایک اہم سوال ہے لیکن اس کا جواب اتنا دشوار نہیں ہے جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ میر و سودا کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف فتنے چاروں طرف سے سر اٹھا رہے ہیں لیکن ان کا اثر کلچر کی بنیادوں اور تہذیبی اداروں کو شدت کے ساتھ متاثر نہیں کر رہا ہے۔ کلچر کا خارجی ڈھانچہ اور مروّجہ اقدار پر معاشرے کا ایمان اسی طرح باقی ہے۔ ایک شہر اجڑتا ہے دوسرا شہر بستا ہے لیکن کلچر کا خارجی اور داخلی ڈھانچہ بنیادی طور پر وہی رہتا ہے۔ تصورِ حقیقت کے اعتبار سے کلچر کا اندرونی استحکام اسی طرح باقی ہے اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں کے باوجود انقلاب کا کوئی گہرا تہذیبی اثر نہیں ہے۔ میر و سودا کا یہ دور تہذیبی و معاشرتی اعتبار سے انقلابی دور ہرگز نہیں ہے۔ اس کی پشت پر صدیوں پرانے تہذیبی ادارے اسی استحکام کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ سارا معاشرہ ان پر ایمان رکھتا ہے اور بحران کے باوجود معاشرہ ان اداروں کو مٹنے یا خود بدل جانے کے امکان پر نہیں سوچ رہا ہے۔ اس لئے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں تہذیبی سطح پر انقلاب آرہا ہو، جہاں نظام اقدار پر سے ایمان اُٹھ رہا ہو اور ساتھ ساتھ معاشرہ اندر سے بدل کر اپنے تصورِ حقیقت کو بدلنے کی سوچ رہا ہو، عظیم ادب کی پیدائش یقیناً ممکن نہیں رہتی۔ جب ایسا دور آتا ہے تو بڑے ادب کی پیدائش بند ہو جاتی ہے اور ادب سے صرف رون رون کی آواز آنے لگتی ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے یوروپ کے کلاسیکی ادب کی مثال لیجئے۔ دانتے کی شاعری میں نشاۃ الثانیہ کے آثار نظر آتے ہیں یا ورجل کی شاعری میں ایک بہتر دنیا کی خواہش کا احساس ملتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم نہ دانتے کو اور نہ ورجل کو انقلابی شاعر کہہ سکتے ہیں۔ وہ تو ان تہذیبی اداروں پر یقینِ کامل رکھتے ہوئے ادب تخلیق کر رہے ہیں جنہیں صدیوں سے وہ اور ان کی قوم کے افراد جانتے ہیں ان ادوار میں سلطنت روما اور کیتھولک چرچ کا معاشرتی نظام، جس نے ان ادوار کو تصورِ حقیقت کا ایک زندہ نظام دیا تھا، زوال آمادہ ضرور ہے لیکن اس زوال آمادگی کے باوجود ان دونوں شاعروں کی فکر کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انہیں پورے طور پر ایک تہذیبی اکائی کی حیثیت سے قبول کئے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے شعور میں تہذیبی اکائی کے تعلق سے یہ استحکام باقی نہ رہتا اور ان کا ایمان ان اداروں اور اقدار پر سے اُٹھ جاتا اور وہ ایک ایسے دور میں زندہ ہوتے جسے جدید اصطلاح میں انقلاب کا نام دیا جاتا ہے، تو وہ تخلیقی سطح پر یہ کام انجام نہیں دے سکتے تھے جو انھوں نے اپنے اپنے دور میں دیا۔ ایک ایسے دور میں جب، شدید قسم کا انقلاب معاشرے کو منتشر کر رہا ہو، اس کے تہذیبی اداروں کو بدل رہا ہو، مروجہ نظام خیال اپنے معنی کھو رہا ہو تو ادیب کے لئے کوئی کارنامہ انجام دینا ایک دشوار تر امر بن جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے میرؔ و سوداؔ کے دور کو دیکھئے تو حیرانی دور ہو جاتی ہے۔ اس معاشرے میں انقلاب کا تصور ذہنی طور پر صرف سطحی بحران تک محدود ہے۔ سارے تہذیبی ادارے اسی طرح جوں کے توں برقرار ہیں۔ تاریخی عمل بنیادی طور پر معاشرے کے اندر وہ انقلاب پیدا نہیں کر رہا ہے جو تہذیبی اداروں کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور نتیجے کے طور پر تخلیقی عمل کو مجروح کرتا ہے۔ تخلیق کی آگ کے لئے معاشرتی و تہذیبی سطح پر بنیادی اداروں پر ایمان کا سالم و قائم ہونا از بس ضروری ہے۔ میرؔ و سوداؔ کا اپنے معاشرے، اس کی اقدار اور نظام خیال سے زندہ اور مربوط رشتہ باقی ہے اور اسی لئے تہذیبی زوال کے آثار کے باوجود وہ تخلیقی سطح پر وہ کام انجام دے رہے ہیں جو ہمارے اپنے دور میں ممکن نہیں ہے۔

ہمارے اپنے معاشرے کا معاملہ میرؔ و سوداؔ کے دور سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے تہذیبی ادارے اب دم توڑ رہے ہیں۔ اقدار اور نظام خیال یہاں تک کہ عقائد بھی اب ہمارے لئے وہ معنی نہیں رکھتے جو آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک رکھتے تھے۔ مادی و صنعتی ترقی طول المیعاد تصورِ تہذیب کو بدل رہی ہے۔ سائنس کے اثرات ذہن انسانی کو انتہائی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ آج ہم تہذیبی سطح پر اندر سے ٹوٹ گئے ہیں۔ اب ایسے میں جب زندگی کی ہر سطح پر انقلاب ہمارے عقائد، خیال، احساس اور جمے جمائے نظام کو ڈھا رہے ہوں تو اچھے اور بڑے ادب کی خواہش اس بچے کی خواہش.

سے کم نہیں ہے جو اس بات پر ضد کر رہا ہے کہ مجھے چندا ماموں لا دو۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہماری نسل ذہانت کے اعتبار سے اپنے اسلاف سے ایک درجہ آگے ہے۔ سنجیدہ ادیبوں میں محنت، توجہ اور لگن کے ساتھ کام کرنے کی خواہش بھی موجود ہے۔ ہم نے پڑھنے لکھنے کو اپنے اسلاف کی طرح، اوڑھنا بچھونا بھی بنایا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ادب میں وہ کارنامے انجام نہیں دے رہے ہیں، جو ہمارے اسلاف نے دئے تھے۔ اس کی وجہ اگر تلاش کی جائے تو صرف یہ ہے کہ ہماری نسل تاریخ کی بے رحمی کا شکار ہے۔ ہم تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے ہیں، جہاں بہت کوشش کے باوجود ہم بہت کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے دور کی تاریخ نے اندرونی انقلاب کی قوتوں کو اتنا تیز کر دیا ہے کہ وہ ہمیں تنکے کی طرح بہا دیتی ہیں۔ یہ ہماری نسل کا مقدر ہے اور اسے قبول کر کے ہمیں کچھ کرنا ہوگا اکثر مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری نسل اپنے مقدر کو قبول کر کے زیادہ سے زیادہ یہ کام کر سکتی ہے کہ وہ آنے والی نسل کے لئے خام مواد بن جائے جس پر کوئی میرؔ، کوئی انیسؔ، کوئی غالبؔ، کوئی اقبالؔ اپنی عظمت کی بنیاد قائم کر سکے۔ اسی بات کو محسوس کر کے ایڈمنڈ ولسن نے کہا تھا کہ اس ادیب کو جو طویل عرصے تک زندہ رہنے والا ادب تخلیق کرنا چاہتا ہے اپنے سعد ستاروں کا شکر گزار ہونا چاہئے اگر اس وقت کوئی شدید قسم کا انقلاب اس کے اپنے ملک اور اپنے دور میں نہیں آ رہا ہے۔ اگر معاشرہ تفسیر عظیم سے بکھر رہا ہے تو شاید وہ لکھنے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔

برخلاف اس کے وہ شخص جو معاشرتی و تہذیبی تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوا ہو جہاں معاشرتی و تاریخی رجحان ایک ایسے نقطے پر جمع ہو گئے ہوں۔ کہ کوئی شخص آئے اور اُن کو ترتیب دے کر ایک شکل میں پیش کر دے۔ جینئس کہلاتا ہے۔ اسی لئے ہربرٹ اسپینسر کا کہنا ہے کہ اس سے قبل عظیم لوگ معاشرے کی تشکیل کریں، ضروری ہے کہ معاشرہ اُن کی تشکیل کر چکا ہو۔ تخلیقی سطح پر کوئی کارنامہ وہ اصلی تہذیبی عناصر کے ایک نئے کیمیادی امتزاج کا نام ہے یا پھر موجودہ کلچر میں نئے عناصر کی جذب پذیری کا نام ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی ایجاد، انکشاف یا ادب و فن کا کوئی کارنامہ اس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتا جب تک کلچر نے خیال و مواد کے سارے عناصر کو اس قابل نہ بنا دیا ہو کہ ان کا کیمیادی امتزاج ممکن ہو سکے۔ پتھر کے دور میں اسٹیم انجن کی ایجاد ہرگز ممکن نہیں تھی۔ اگر وہ سارے عناصر جو بارش کا سبب بنتے ہیں یکجا ہو گئے ہیں تو بارش ضرور ہوگی۔ ہر چیز اس وقت تک تخلیقی سطح پر زندہ رہتی ہے جب تک معاشرہ اور اس کا نظام خیال زندہ اور صحت مند رہتا ہے اگر معاشرہ صحت مند نہیں ہے تو اس معاشرے کا ادب نہ صرف ادب بلکہ ہر تخلیقی سرگرمی زوال پذیر

ہو گی۔ اس لئے اگر آج ہمارے ادب کے پودے مرجھا گئے ہیں تو اس کے اسباب کی تلاش ہمیں اپنے معاشرے اور اپنے نظام خیال میں کرنا ہو گی۔

اب ایسے میں ایک امکانی صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا دیو قامت 'مفکر ادیب' پیدا ہو جو اپنی مختصر سی زندگی میں دو بڑے ادیبوں کا کام انجام دے۔ ایک کام یہ کہ وہ نئے اقدار و معانی کے پودے اپنے معاشرے کی سرزمین میں لگائے اور دوسرے یہ کہ انہیں اتنا پروان بھی چڑھا دے کہ وہ پھل دینے لگیں اور معاشرہ ان پیڑوں پر لگے ہوئے پھلوں کا ذائقہ چکھ سکے۔ جب تک یہ نہ ہوگا تخلیقی قوت صرف 'ہیجان' کی شکل میں زندہ رہے گی اور سارا معاشرہ اسی ہیجان سے اپنی ذہنی بھوک آسودہ کرکے مٹی کے ڈھیلوں کو ادب کا نام دیتا رہے گا۔

تخلیق کی سطح پر یہ صورت حال بہت تشویش ناک ہے لیکن جہاں ادیبوں نے سوچنا کا کام بند کر دیا ہو۔ جہاں ادیب خود اندھے اور بہرے ہوتے ہیں۔ جہاں ادیب مسائل سے زیادہ مصلحتوں میں دلچسپی لینے لگے ہوں۔ جہاں ذہنی بزدلی اور سمجھوتوں نے فکر کے سوتے خشک کر دیئے ہوں وہاں ہماری نسل خام مواد بن جانے کا کام بھی انجام نہیں دے سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نسل کے ادیبوں پر تنہائی عذاب بن کر نازل ہوئی ہے۔ ہماری آرزوئیں گونگی ہیں۔ دھل میں رنگ اڑ گیا ہے اور آج ہم تنہائی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہیں اور بھری دنیا میں تنہا نظر آتے ہیں۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے کہ جو کچھ دیکھ رہے ہیں اسے معاشرے کو بھی دکھا دیں۔ جو کچھ محسوس کر رہے ہیں اسے معاشرے کو بھی محسوس کرا دیں

—— آج اردو ادب کو ہرکاروں اور گورکنوں کے بجائے جری سورماؤں کی ضرورت ہے۔ ایسے جری سورما جو زندہ رہ کر موت کا تجربہ کرنا جانتے ہوں۔ جو میر یا اقبال کی ڈیڑھ درجن خصوصیات گنوانے، روایتی انداز میں غزلیں، نظم کہنے یا بندھے ٹکے موضوعات پر افسانے ناول لکھنے کے بجائے عہد حاضر کے مسائل پر سوچنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو عہد حاضر کے طوفانی دھاروں اور ہلکی ہلکی پھواروں دونوں سے باخبر ہوں۔ جو روایت کو اپنا کر روایت کو توڑنے کی قوت بھی رکھتے ہوں۔ جو معاشرے کو فکری مسائل میں شریک کرکے اسے تبدیلی کا نیا شعور دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں۔ اور شاید عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا یہی سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔

(انجمن اردو، کراچی یونیورسٹی میں پڑھا گیا)

بلراج کومل

خون اور روشنائی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اردو کے جدید ادب کا زوال اُس وقت شروع ہوا جب ترقی پسند تحریک دم توڑ گئی۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ جدید ادب کا زوال اس دن سے شروع ہو گیا تھا جس دن ترقی پسند تحریک کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ مغرب کے غیر صحت مند اثرات کی وجہ سے جدید اردو ادب کی رسوائی ہوئی۔ ایک اور رائے کے مطابق اس تشویش ناک صورت حالات کی بنیادی وجہ ہمارا وہ معاشرہ ہے جس کو تقسیم ہندوستان کے سنگین حادثہ سے ایسا خطرناک دھچکا لگا ہے کہ اس کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے ان آرا اور خیالات کے علاوہ بھی بہت سے نظریات ہمارے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔

فرانسیسی ناول نگار ستاں دال کا خیال ہے کہ کسی بھی عظیم تخلیق کو لوگوں تک پہنچنے کیلئے کم از کم ۵۰ برس کی طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے غلاظت اور عامیانہ پن ایک دن میں لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دونوں نظریے سیلیبرڈی نظریے ہیں۔ ہم ادبی اور غیر ادبی فیشنوں کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ ان کے سفر کی رفتار کسی بھی تیز رفتار مشین سے کم نہیں ہے۔ جدید ترین دور کا سب سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ اس دور میں بالوں کے سٹائل اور شاعری کے سٹائل میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے کوئی آدمی وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون سا سٹائل کب

بدلے گا۔

میں اپنا نقطۂ نظر اور تجزیہ پیش کرنے سے پہلے اس بات کا اعلان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں 'قدیم' اور 'جدید' کی بحث میں جدید کے حق میں ہونے پر فطری طور پر مجبور ہوں کیونکہ قدیم جدید کا حصّہ بن چکا ہے۔ اور اس کے وہ حصّے یقیناً زندہ ہیں جن کو زندہ رہنا چاہیئے۔ اور اگر 'قدیم' کے کچھ حصّے زندہ نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زندہ نہیں رہ سکے۔ ہماری ذہنی اور جسمانی موت اس وقت واقع ہوتی ہے جب ہمارا رشتہ زندگی اور اس کے مظاہر سے کٹ جاتا ہے۔ اس بات کا "قدیم اور جدید" کی بحث کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ جدید شاعری پر اردو میں جتنی بحثیں آج تک ہوئی ہیں ان میں تان اس بات پر توڑی گئی ہے کہ اس کی جملہ بدعتوں کا کارن شعرا کی زبان اور ادب کی روایات اور اصولوں کے خلاف وہ بغاوت ہے جو سراسر ناجائز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید شاعری کی ناکامی کا باعث ایک تکنیکی حادثہ ہے۔ جو لوگ اس نقطۂ نظر کو جزوی طور پر غلط سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ہم تکنیکی روایات کے علاوہ اپنی قومی اور تمدّنی روایات کو نہیں سمجھتے اس لئے ہم وہ شاعری پیدا کر رہے ہیں جس کا آغاز یا انجام کوئی نہیں ہے۔

روایت کا مفہوم ہمارے یہاں اقدار کے اعتبار سے متعین نہیں کیا جاتا بلکہ تکنیک فارم اور ہئیت کے اعتبار سے متعین کیا جاتا ہے۔ اس لئے 'روایات' کے ذریعہ صورت حالات کا تجزیہ کرنا کافی آسان نسخہ ہے اس لئے میں سمجھتا ہوں مقبول عام بھی ہے۔ اگر ہمیں ادب کا تجزیہ کرنا ہے تو کیوں نہ ادب ہی کا تجزیہ کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ قصور 'روایات' کا ہے یا ہمارے ادیبوں کا۔ میں قدیم اور جدید کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ قدیم کے وہ حصّے یقیناً زندہ ہیں جن کو زندہ رہنا چاہیئے۔

میں اس بحث کو شاعری تک محدود رکھنا چاہتا ہوں تاکہ آسانی کے ساتھ نتائج کو ترتیب دے سکوں۔ پچھلے پندرہ سال کے شعری ادب کا خاکہ کچھ اس قسم کا ہوگا۔ ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر "ترقی پسند ادب" کی تخلیق۔

۱۹۵۲ء کے بعد یہ آوازیں بلند ہونے لگیں کہ ترقی پسند تحریک دم توڑ رہی ہے۔ اور سردار جعفری، ساحر، جاں نثار اختر، مجروح اور نیاز حیدر کی آوازیں کم کم سنائی دینے لگیں رسائل اور اخبارات میں غزلوں کی بھرمار ہوگئی اور شعرا میر کے اسلوب میں نئی خوبیاں تلاش کرنے لگے اور کچھ لوگ اسی اسلوب میں غزلیں کہنے لگے۔ ۱۹۵۷ء کے بعد وہ نسل دھیرے دھیرے سامنے

آنے لگی جو وزیر آغا کے الفاظ میں 'مجروح انا' کا شکار ہے۔ اس وقت اسی نسل کا طوطی بول رہا ہے۔

غزل کے حق میں لکھنے والے نقادوں کا خیال ہے کہ غزل کی اشاریت اور رمزیت ہی غزل کی جان ہے اور اس کے ذریعے شاعر سماج کے اندر پائے جانے والے جذباتی اور روحانی رویوں کا عکس پیش کرتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۹۵۱ء کے بعد ہماری قومی اور سماجی زندگی میں قطعاً کوئی تحرک نہیں تھا۔ پچھلے دس پندرہ سال کی غزل کی شاعری سے ہمارے سامنے ہمارا یا ہماری سماجی زندگی کا جو کردار ابھرتا ہے وہ اس کردار سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم انحطاط کی ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر بڑی سرعت سے اترتے گئے ہیں۔ جب ہم زندگی میں کسی مسئلہ کو خلوص سے اور براہِ راست طریقہ سے نپٹانا نہیں چاہتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یا تو ہم بددیانت ہیں یا ہم اس مسئلہ کو نمٹانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ ہماری غزل کی جدید شاعری رمزیت اور اشاریت کے ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے باوجود نہ تو کوئی ایسی جذباتی تصویر پیش کرتی ہے جو ہماری یا ہمارے سماج کی ہو اور نہ ہی ہمیں کسی ایسے روحانی تجربے سے دوچار کرتی ہے جو منفرد ہو۔ بہ حیثیت مجموعی ہماری غزل کی شاعری اس ہجوم میں اضافہ کرتی ہے جس کے کردار کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ ناصر کاظمی، فراق گورکھپوری، فیض۔ صرف یہی گنے چنے نام ہیں جن کی غزلیہ شاعری اپنا منفرد کردار رکھتی ہے۔ باقی لوگوں کا کام الفاظ کی ترکیب کو بدل کر اشعار کے ذریعہ چٹکیاں لینا اور قاری کو گدگدی کرنا ہے۔

پچھلے دو تین برسوں میں غزل کے ناک نقشے میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ یہ تبدیلی ردیفوں اور قافیوں کے استعمال میں ہے۔ شاعری کے مواد کے اعتبار سے نہیں ہے۔ اور عام رویہ شعر سے EPIGRAM یا تیز طرار جملے اور لطیفے کا کام نکالنے کا ہے۔ اس قسم کی غزلیں انشا کے دور کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ شاید ہمارے شاعروں کی ذہنی سطح انشا کے دور کی ذہنی سطح سے بلند نہیں ہو سکی یا گھوم پھر کر ہم دوبارہ اسی ذہنی سطح پر پہنچ گئے ہیں یا اگر جدید ترین غزل کی شاعری ہماری زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے تو وہ زندگی ہی بے معنی ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ اس کی کوئی بہتر تصویر پیش کی جا سکے۔

ہمارے بہت سے نقاد غزل کے امکانات کا اشتہار دیتے وقت ان سب باتوں کو سرے سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔

— لیکن اس میں غزل کا فارم کے طور پر کوئی قصور نہیں ہے۔

نظم کے بارے میں بحث کرنا غالباً زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ نظم کا تنوع بحث کے امکانات کو وسیع تر کر دیتا ہے۔ ہمارے بہت سے جدید شاعر ایذرا پاونڈ کا حوالہ اس وقت دیتے ہیں جب انہیں اپنا کوئی گناہ چھپانا ہو یا کسی متوقع گناہ کے لئے وجہ جواز تلاش کرنا ہو۔ ایذرا پاونڈ کے علاوہ ایلیٹ اور فرانسیسی شعرا کے ناموں کا استعمال بھی وہ کچھ اسی ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ نظم کی بحث کے سلسلہ میں میں پاونڈ کا حوالہ بنیادی طور پر ایک مختلف مقصد کے لئے دے رہا ہوں اور یہ مقصد اس حوالہ ہی سے بخوبی واضح ہو جائے گا۔

ایذرا پاونڈ نے شاعروں اور ادیبوں کو چھ جماعتوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱- INVENTORS — اختراع کرنے والے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ادب میں کوئی نئی طرح ڈالتے ہیں۔ ہمارے یہاں یہ درجہ کسی حد تک میراجی اور راشد کو دیا جا سکتا ہے۔ پاونڈ ان لوگوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا لیکن اس کی رائے ہے کہ ہم ہومر کے پیش روؤں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

۲- THE MASTERS عظیم فن کار اور ادیب۔ یہ لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، ان میں بھی حقیقی کرداروں کا مرتبہ متعین ہونے میں ایک طویل عرصہ گذر جاتا ہے۔ اردو میں اقبال کے بعد کوئی MASTER پیدا ہونے کے امکانات پیدا نہیں ہوئے۔

۳- THE DILUTERS محلول کو پتلا کرنے والے۔ یہ لوگ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ INVENTORS اختراع کرنے والوں اور (MASTERS) عظیم فنکاروں کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ لیکن ان کی اپنی تخلیقات میں شدت کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ ان کا کام چینی یا شکر کا محلول تیار کرنا یا اس کو پتلا کرنا ہے اور اس کو قطرہ قطرہ بانٹنا ہے۔ اردو زبان کا دامن محلول تیار کرنے والوں کی وجہ سے مالا مال ہے۔ ایک میر پیدا ہوتا ہے تو صدیوں بعد تک 'میرچے' پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اقبال پردۂ ظہور میں آتا ہے تو سینکڑوں 'اقبالچے' برسوں تک ڈگڈگی پیٹتے رہتے ہیں۔ بعض محلول تیار کرنے والے اپنے ملک کی چینی یا شکر پر اکتفا نہیں کرتے وہ مواد کے لئے فرانسیسی اور انگریزی شعرا سے مدد حاصل کرتے ہیں۔

۴- ادیبوں اور شاعروں کی چوتھی قسم کا ایذرا پاونڈ نے کوئی نام نہیں رکھا۔ لیکن یہ لوگ بھی اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے خاصے اسلوب میں اچھی خاصی چیزیں لکھتے ہیں اور ان کے کلام سے انتخابات اور درسی کتب کی زینت ہوتی ہے۔ ان کا کلام بد ذائقہ نہیں ہوتا لیکن اس کا

کوئی منفرد ذائقہ بھی نہیں ہوتا۔ اردو زبان اس قسم کے شعرا سے ہرگز محروم نہیں ہے۔ ہمارے اپنے دور میں بہت سے شعرا کا یہی مرتبہ ہے۔ وہ خوبصورت شعر کہتے ہیں لیکن ان کا کوئی منفرد ذائقہ نہیں ہوتا۔

۵۔ BELLES LETTRES خالص ادب۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس قسم کے ادیب ہمارے یہاں یا تو پیدا ہی نہیں ہوئے یا پیدا ہونا ہی نہیں چاہتے۔ یہ لوگ بہت بڑے ادیب نہیں ہوتے لیکن پاؤنڈ کے الفاظ میں ادب کے کسی پہلو یا کسی فارم پر اپنے اثرات مرتسم کر جاتے ہیں:

۶۔ ادیبوں اور شاعروں کی چھٹی قسم انتہائی دلچسپ ہے۔ یہ وہ مجاہد ہیں جو کسی پاگل پن کسی دیوانگی کسی فیشن کا علم بلند کرتے ہیں۔ یہ لوگ برسوں، کبھی بار صدیوں کے لئے ادب کے میدان میں دریا کی طرح بہتے ہیں لیکن جب یہ ختم ہو جاتے ہیں تو ان کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ اردو زبان کا دامن خوش قسمتی سے ان سے تہی نہیں ہے۔ یہ لوگ کبھی اپنے نام بدل لیتے ہیں اور کبھی لباس۔ اپنا رشتہ ہمیشہ فرانسیسی تنزل پسندوں اور علامت پسندوں کے ساتھ جوڑتے ہیں ادب کا مطالعہ کرتے وقت ان کی دلچسپی کا مرکز ادبی فیشن ہوتے ہیں۔ فن پاروں کی اہمیت معنویت اور ان کے تاریخی اور سماجی پس منظر سے واقف ہونے کی وہ کبھی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

دنیا کی ہر زبان کے شاعر اور ادیب ایزرا پاؤنڈ کی جماعتی تقسیم میں فٹ کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن کسی بھی زبان کا ادب مجموعی طور پر اس وقت تک عظیم نہیں کہلا سکتا جب تک اس زبان کے شاعر اور ادیب اس زندگی کی جذباتی اور روحانی کشمکش کی تصویر پیش نہیں کر سکتے جس کے زیر و بم سے متاثر ہونے کا وہ دعوے کرتے ہیں۔ اختراع کرنے والوں اور فیشن چلانے والوں کے درمیان پاؤنڈ نے ادیبوں کی پانچ جماعتوں کو رکھا ہے لیکن اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دور انحطاط میں یہ فرق سرے سے مٹ جاتا ہے۔ MASTERS یعنی عظیم شاعر اور ادیب صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی زبان صرف محلول تیار کرنے والے یا صرف فیشن چلانے والے ہی پیدا کرتی رہے تو معاملہ یقیناً سنگین ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اردو زبان کے ادیبوں اور شاعروں کی بہت بڑی تعداد محلول تیار کرنے والوں کی ہے۔ اور اگرچہ دنیا کی دوسری زبانیں ہم سے اس حیثیت سے مختلف نہیں ہیں۔ لیکن یہ امتیاز صرف اردو زبان کو حاصل ہے کہ اس کے شاعر نہ صرف گھٹیا شکر اور چینی کا محلول تیار کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات محلول کا محلول تیار کرتے ہیں۔ یہ عمل ایک طویل عرصہ سے جاری ہے اور اس کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی۔

نظم کے نئے فیشنوں کی تعداد غزل کے نئے فیشنوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ غزل

کے فیشن صرف قافیہ ردیف کی جدتوں اور تیز طرار جملوں تک محدود ہیں لیکن نظم کے فیشن تکنیکی فیشنوں کے راستے سے ہوتے ہوئے، فلسفیانہ موشگافیوں کی حدود تک جا پہنچے ہیں۔ میں ادب کے انحطاط کو ہرگز کوئی تکنیکی حادثہ نہیں سمجھتا۔ ادب کا انحطاط سراسر اقدار کے انحطاط کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس کو اظہار کا کوئی معجزہ نہیں بچا سکتا اور نہ ہی اس پر پردہ ڈال سکتا ہے۔ جب ہم جدید ترین شاعری کے مجموعی کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں کیوں اس کے اندر وہ شدت اور تازگی نہیں ملتی جو اچھی شاعری کی خصوصیت ہے؟ اس سوال کا جواب یہ نہیں ہے کہ ہمارے شاعر تکنیک کی طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں اور ان کی ساری توجہ مواد کی طرف ہے۔ اگر ہمارے شاعروں کی توجہ صرف مواد کی طرف ہی ہوتی تو شاید اردو کی نئی شاعری کا وہ حال نہ ہوتا جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔

اردو کی نئی شاعری کا کرائسس درحقیقت موضوع کا کرائسس ہے اور اس طرح اقدار کا کرائسس ہے۔ ہمارے شاعر جس زندگی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ حقیقی زندگی نہیں ہے۔ وہ محض ترکیبی، مرکباتی امتزاجی SYNTHETIC خاکہ ہے جسے ہم نے کتابوں رسالوں اور اشتہاروں کی مدد سے تیار کیا ہے اور جس کا نام ہم نے اپنی تسلی کے لئے حقیقی زندگی رکھ لیا ہے۔ اردو کے جدید شاعر کا ذہنی کرب ایک ایسے آدمی کا ذہنی کرب ہے جو زندگی کے محرکات سے کٹ چکا ہے۔ جو سمٹ کر اپنے خول میں اس لئے گھس گیا کیونکہ باہر کی آب و ہوا اسے راس نہیں آئی۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کے چاروں طرف رہنے والے سب لوگ اپنی حسّوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ وہ سرخ، سبز، سیاہ و سپید میں تمیز نہیں کر سکتے ہیں۔ اور وہ سب اس لئے زندہ ہیں تاکہ خودکشی کے بارے میں سوچ سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اپنی حسیں یا تو بیکار ہو چکی ہیں یا پیدائشی طور پر کمزور ہیں۔ (RIMBAUD اور پال ورلین PAUL VERLAIN شراب، حشیش اور دیگر منشیات کے ذریعہ اپنی حسّوں کو مسخ کرنے یا ان کے عمل کو شدید تر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہمارے شعرا کی حسیں فطری طور پر مسخ شدہ ہیں)۔ درد و کرب کا اس قدر شیدائی ہونے کے باوجود اور حساس طبیعت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود وہ شاعر اپنے ماحول کی غلاظت دیکھ کر آنکھیں موند لیتا ہے۔ اس کے عامیانہ پن کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ سیاسی سمجھوتہ بازی کو اپنا نصب العین بنا لیتا ہے اور ادب اور آرٹ کے نام پر اپنا اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کا ہر گناہ معاف کر دیتا ہے۔

اس لحاظ سے اردو کا نیا شاعر اور ادیب بددیانت ہے۔ اور یہی اردو کی نئی شاعری کے

انحطاط کی بنیادی وجہ ہے؟ ہندوستان اور پاکستان کی سماجی زندگی میں پچھلے پندرہ برس میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن ہمارا شاعر ان سب سے غافل ہے۔ وہ تنہائی موت اور غم کا شاعر صرف اس لئے ہے کہ اسے نہ تو اپنے ماحول کی غلاظت نظر آتی ہے اور نہ ہی اپنا عامیانہ پن۔

اس کا غصہ اس کا فن مکمل طور پر ترکیبی اور رمزیاتی ہے۔ اس کا غصہ یا کرب جیتے جاگتے صحت مند آدمی کا غصہ یا کرب نہیں ہے کیونکہ صحت مند آدمی کا غصہ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ اس کا شور و غل کسی مشین کی میکانکی کھڑکھڑاہٹ ہے جس کو سن کر شاعر خود تو بیزار ہو جاتا ہے لیکن اپنے قارئین سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس پر سر دھنیں اس کی کاریگری کی داد دیں۔ اردو کے جملہ عباس اطہر، افتخار جالب، عادل منصوری، اسد محمد، اختر احسن اور ان کے فلاسفر دوست 'آدھے' اور 'چوتھائی' آدمی اسی جماعت میں آتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ہماری حیات موجود سراسر ناقابل قبول ہے۔

ایسے شاعروں کے ہاں حسیّوں کا ردل ذہن کے عوامل کی ترتیب میں نہایت معمولی ہے۔ یہ لوگ شاعری اور ادب کی تفصیلات اور اظہار کے طریقوں کو شاعری کا نام دینے پر مصر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر سب سے نامربوط الفاظ کا انبار لگا دیا جائے تو جو چیز ظہور میں آئے گی اس کا نام شاعری ہوگا۔ ان کا شجرہ نسب بنیادی طور پر انتہا پسند فرانسیسی، سریلسٹوں، کیوبسٹوں اور علامت پسندوں سے جا ملتا ہے۔ اور شاعری کے میدان میں تجربہ نگاروں کا المیہ یہ ہے کہ وہ الفاظ اور تفصیلات کو شاعری کی سطح تک لے جانے میں ہمیشہ ناکامیاب رہتے ہیں۔ اس لئے کہ شاعری کبھی الفاظ کے ذریعہ معانی تک نہیں پہنچتی بلکہ ہمیشہ معانی کی قوت کی وجہ سے مخصوص الفاظ کی شکل اختیار کرتی ہے۔

یہ انتہائی اہم سوال ہے کہ کیا ہماری زندگی واقعی بے معنی ہے؟ اس ایٹمی دور میں یورپ کے تاریک بین فلاسفروں و وجودیت پسندوں کا کم از کم یہی خیال ہے۔ اگر اب یورپ میں کوئی ایسا ادیب پیدا ہوتا ہے جو امید کی ایک کرن بھی پیش کرنے کے اہل ہے تو یہ بہت بڑا خوشگوار حادثہ تصور کیا جاتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کے اثرات ہمارے ادیبوں پر بھی پڑتے ہیں اور وہ بڑے فخر سے اعلان کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ زندگی سراسر بے معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی سراسر بے معنی ہے جو وہ اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں۔ متوقع ایٹمی بربادی ہمارے لئے لمحۂ فکر یہ مہیا کرتی ہے لیکن زندگی

کو مکمل طور پر بے معنی صرف اس شخص کے لئے بناتی ہے جو اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اپنی محدود ذات کو تمام کائنات سے افضل سمجھتا ہے۔ اگر زندگی کے بے معنی ہونے کا دنیا بھر کے تاریک بین شاعروں کو اس قدر یقین ہے تو دیانتداری کا تقاضہ یہ ہے کہ سب سے پہلے انھیں خودکشی کرنے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اگر وہ زندہ ہیں اور ان کے علاوہ بھی کروڑوں لوگ زندہ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا کارواں کسی کتابی اصول کے بجائے کسی فطری اصول کے تحت چل رہا ہے اور چونکہ ہم زندگی کے محرکات اور مظاہر سے کٹ گئے ہیں اس لئے اس اصول کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اس نقطہ نظر کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ میں امید کا فلاسفر ہوں اور مجھے چاروں طرف روشنی نظر آتی ہے میں کبھی اداس نہیں ہوتا، میں کبھی نہیں روتا یا میں کبھی خودکشی کے بارے میں نہیں سوچتا۔ میں یہ سب باتیں سوچتا ہوں لیکن ان کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ دنیا کے اندر بے پناہ غلاظت اور عامیانہ پن کے ساتھ ساتھ دکھن بھی موجود ہے جو کرۂ ارض پر زندگی کے چہرے پر گرد کی تہ نہیں جمنے دیتا۔ جب کوئی شاعر اس حسن کی عدم موجودگی یا جزوی یا مکمل کمی کو شدت سے محسوس کرتا ہے تو وہ بادلیئر، دوستوسکی اور ریمبو کی طرح کرب کا شکار ہوتا ہے۔ قلابازیاں نہیں لگاتا۔ نہ ٹیڈی بوائے بنتا ہے نہ BEATNIK اور اگر صرف فیشن کرنا چاہتا ہے تو وہ ملارمے یا امی لاول بن جاتا ہے۔

شاعری کے محاسن کا میزان گرامر کے اصولوں سے نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی بحر و وزن کے تجربوں کے ذریعہ اس کی عظمت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ زبان اور اس کے ادب سے واقف ہونا شاعر کی تربیت کا حصہ ہے۔ اس تربیت کے بغیر شعر کہنا جرم ہے۔ لیکن زبان کو استعمال کرنے کا انداز شاعر کا ذاتی مسئلہ ہے۔ جب ہم اچھی نظموں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم اس عمل کو تجزیہ نہیں کرتے جو الفاظ کو شعر کا روپ دیتا ہے بلکہ ان الفاظ کا تجزیہ کرتے ہیں جو یا تو شعر کا درجہ پا چکے ہیں یا نہیں پا سکے ہیں۔ شاعری سے متعلقہ بحث کو بحر و وزن اور گرامر تک محدود کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک خاص طریقہ کار کو جاری رکھنے پر مصر ہیں اور ہم بہت سے شاعروں کے اس لئے خلاف ہیں کیونکہ وہ ہمارے انداز سے گفتگو نہیں کرتے۔ کوئی نظم یا فن پارہ اس وقت ناکام ہوتا ہے جب اس کا خالق الفاظ کے ذریعہ صرف شعری خاکے تیار کرنا چاہتا ہے جبکہ الفاظ کا مقصد تجربات کو پیش کرتا ہے، زندگی کی تصویر کشی کرنا ہے۔ اگر شاعر کا نظام

ضبط نامکمل ہے اور تجربات خام ہیں تو ہمارے سامنے یا تو محض الفاظ رہ جاتے ہیں اور یا خام تجربات کی شکستہ ہڈیاں۔ شاعری درمیان میں سے نکل جاتی ہے۔ الفاظ، خام مواد اور تفصیلات کو شاعری کا درجہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب ایلیٹ کے قول کے مطابق ہم خون کو روشنائی میں بدلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم بلا مقصد روشنائی کے دریا بہاتے رہتے ہیں جبکہ ہماری صلاحیتیں یا تو پیدائشی طور پہ کمزور ہوتی ہیں یا مسخ ہو چکی ہوتی ہیں اور یا ہم خون اور روشنائی میں تمیز کرنے کا مذاق کھو بیٹھتے ہیں۔

عمیق حنفی

وجودیت
کا
پس منظر اور مسلک

اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

لیکن روشنی جو مغرب کے لئے بلائے جان بنی ہوئی ہے روشنی طبع نہیں، روشنی طبیعیات ہے۔ دو برقی دھاروں کے تصادم سے شعلۂ جہاں سوز بن کر لپکنے والی روشنی ہے۔ مغربی تہذیب کا المیہ یہ ہے کہ وہ بیک وقت مادّی کمال اور روحانی زوال میں مبتلا ہے۔ وہ شاہ میداس کی طرح جس شے کو چھوتی ہے سونا بن جاتی ہے لیکن حرکت و حرارت و حیات کی برکتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ خود مغرب کا جسم۔ زر و آہن کا مرکب بن گیا ہے۔ اس کا ذہن پارہ پارہ ہے۔ دواؤں کے ساتھ امراض، نفسیات دانی کے ساتھ جنون و خبط الحواسی، سائنس کے ساتھ بے اطمینانی اور آسائشوں کے ساتھ ہوا و ہوس دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ آفاقی اور مکانی فاصلے کم اور دلی اور رُوحانی دوریاں زیادہ ہوتی جا رہی ہیں۔ جمہوریت اور حُریت کے بلند بانگ دعوے منڈیوں، بنکوں، ایٹمی اسلحہ خانوں، کارخانوں اور سیاست کدوں میں بیٹھے ہوئے انسانی مردوں کے کمروں میں انسانیت کا خون پینے والے جدید کاتبانِ تقدیر کے قہقہوں میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ گرجے خالی ہیں۔ کلبوں میں لادینیت کا غلبہ ہے۔ غذا کی افراط ہے مگر ہاضمہ خراب ہے۔ احساس مشینوں کو جذب نہیں کر سکا ہے۔ فطرت سے رشتے ٹوٹ چکے ہیں اور نئی میکانکی تہذیب سے پوری طرح استوار نہیں ہو سکے ہیں۔ ہکسلے کہتا ہے کہ امریکہ میں چار پانچ فیصدی بچوں ہی نے گلاب دیکھی ہوگی اور ان میں سے بھی اکثر نے تصویروں یا فلموں میں۔ ایک شاعر اس دن کا منتظر ہے جب درخت دیواروں سے بڑے ہوں گے!

وہ ہولناک جنگوں کے طوفانِ آتش و خون سے گزر کر مغرب کا دیوتا ماتھے پر شکنوں کا سمندر سمیٹے، تیسرے ہولناک تر سیلاب کی آہٹ پر کان لگائے، راتوں کی نیند اور دلوں کا چین حرام کر کے ایک طلسمی جزیرے کے ساحل پر سر بزانو بیٹھا ہوا ہے۔

فنکار اور ادیب کیا کریں؟ تجلّی کی راہ اختیار کریں یا ستتار کی؟ آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑیں یا لبِ بام محوِ تماشہ رہیں؟ کاغذ کی ناؤ پہ "کشتیٔ نوح" کا لیبل لگا کر خود کو نوح سمجھنے لگیں یا لاشعور کی سیاہ گہرائیوں میں آبدوز کشتیاں چلاتے رہیں؟

پہلی عالمگیر جنگ نے استتار کا درس دیا۔ مفروضات کا عقلی جواز اور منطقی سہارا ڈھونڈھ نکالنا کوئی کارِ دشوار نہیں ہے۔ تباہی اور بربادی سے خوفزدہ ذہن ہمیشہ پُراسرار تاریکیوں میں پناہ گزیں ہوتا ہے۔ اپنے فراری ارادوں کو معقول ثابت کرنے کے لئے نئی اصلاحیں تراشتا ہے اور پرانی اصلاحوں کو نئے معنی پہناتا ہے۔ حاضر کو ظلّی اور عارضی اور غائب کو حقیقی اور دائمی ثابت کرتا ہے۔ اس دور میں دادائیت اور سرریلزم نے حقیقت کے اصل وجود اور اصل الاصول تک رسائی کا راستہ ظاہری ربط و ترتیب اور خول کی شکست کو قرار دیا۔ حقیقت کا وجود سطحِ شعور پہ تلاش کرنے کے بجائے لاشعور کی ازلی اور ابدی گہرائیوں میں ڈھونڈھنے کی دعوت دی۔ عالمِ خواب کو عالمِ واقعات اور عالمِ جنون کو عالمِ ہوش سے افضل و برتر ہی نہیں ثابت کیا بلکہ یقینی اور کلی حیثیت عطا کر دی۔ زبان، قلم، فکر، عمل سب کی محدودی رفو کاری کو آئینہ دار ترجمانِ حقیقت مانا۔ لاشعور کے شعوری اتباع کو کمالِ فن ٹھہرایا۔ الفاظ کی معنویت ماورائے لغات میں مکین رہتی ہے۔

ان تمام اسرار و رموز کی پیر و مرشد سرریلزم کی ابتدا دادائیت کی صورت میں ہوئی تھی جو دراصل دودھ پیتے بچے کی پہلی کوششِ گویائی یعنی "دادادا" کی علامت تھی اور ایک نوزائیدہ معصوم کو دنیا کو سمبولائز کرتی تھی۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور امیری فیروزکوہی کا ایک شعر پیشِ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

چگونہ مردم آگاہ شادماں باشند	کہ شادمانیٔ ہر کس بقدرِ غفلت اوست

متنبّی نے بھی یہی بات کہی ہے۔

ذوالعقل یشقی فی النعیم بعقلہ	واخ الجہالۃ فی الشقاوۃ ینعم

اور دوستائیفسکی کا احساس بھی ایسا ہی ہے:۔

"اس دور کا خاصہ یہ ہے کہ اشراف اور ذہین لوگ عذابِ آگہی میں مبتلا ہیں اور ادنیٰ اور معمولی فہم و فراست کے لوگ مزے اڑا رہے ہیں"

دشمنیٔ طبع اور آگہی کی بلاخیزی اور عذاب ناکی کا احساس انسان کو ہر دور میں رہا ہے۔ کم ہی لوگ سقراط، ابراہیم، عیسیٰ اور منصور بن حلاج کی سنت پر قائم رہ سکے ہیں ہیملاک کا پیالہ، صلیب، سولی اور کربلا کا میدان جان کی قیمت ادا کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ سرریلسٹوں نے اس عذابِ آگہی میں مبتلا ہونے کے بجائے چراغِ آگہی گُل کر دینے اور شعور کی تحت الثریٰ میں فردوسِ گمشدہ کی جستجو کرنے کا مشورہ

دیا۔ ہر چند کہ اس تاریک راستے پر بھٹکنے میں ایک خاص لطف تھا لیکن مغرب کے اکثر و بیشتر ادیبوں اور فنکاروں نے سُرریلزم کے مجذوبانہ اسلوب، بے جستگی اور طریقِ علائم سازی سے مستفیض ہونے ہی پر اکتفا کیا۔

لیکن مغرب کا المیہ سُرریلزم کی تشخیص اور تجزیہ کے باوجود اپنی جگہ تھا۔ انسان از خود رفتہ و بیگانہ ہو رہا تھا۔ شہروں کی آبادی، گرمیِ بازار اور چہل پہل کے بڑھنے سے اس کے احساسِ تنہائی اور اجنبیت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ انسان ایک دیو ہیکل مشین کا بے لبس اور حقیر پرزہ بن گیا تھا۔ المیۂ انسانی کے اس دردناک پہلو نے چیک ادیب کارل کاپک (CAREL CAPEK) کو ۱۹۲۰ء میں آر یو آر (ROBOTS UNIVERSAL ROBOTS) نامی تمثیل لکھنے پر مجبور کیا۔ انسان کی غاصبانہ نیستی، نامستعدی، بے حسی، مردہ دلی، پست ہمتی اور بے بسی کا مرثیہ الڈوس ہکسلے (ALDUOUS HUXLEY) نے ۱۹۲۱ء میں اپنے ناول (BRAVE NEW WORLD) میں لکھا ہے۔ احساسِ تنہائی، دائمی حزن و ملال اور ابدی اُداسی کے مجسم روپ فرانز کافکا (KAFKA) نے ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں دو ناول لکھے، دی DER PROZES (آزمائش) اور DAS SCHLOSS (قلعہ)۔ ان دونوں ناولوں میں اپنے ہمعصر انسان کے احساسِ تنہائی اور فکرمندی (Anxiety) کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کارل یاسپر (KARL JASPER) کی کتاب "عہدِ جدید میں انسان" بھی فرد کا المیہ پیش کرتی ہے۔ شیستوف (۱۹۳۱ء ۱۸۶۶ء) اور بردیائیف (۱۹۴۸ء، ۱۸۷۴ء) بھی فرد کی بے بنیادی (ROOTLESSNESS) بے تعلقی اور از خود رفتگی پر ماتم کرتے ہیں۔ فرینچ ادیب آندرے ژید (۱۹۵۱ء - ۱۸۶۹ء) جرمن شاعر رلکے (۱۹۲۶ء ۱۸۷۵ء) اور ہسپانوی شاعر اُنامُنو (۱۹۳۶ء ۱۸۶۴ء) بھی انسان کی اس المناک جگر سوز اور دلدوز صورتِ حال پر نوحہ کناں ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد کانٹ کے مربوط اور مرتب معقولی فلسفے کے خلاف ردعمل نے شدت اختیار کر لی اور نطشے اور ہسرل (NEITZSCHE AND HUSSERL) کے وجدانی نظریات مقبول ہونے لگے۔ مغرب اپنے درونِ خانہ ہنگاموں سے باخبر ہونے لگا اور نطشے کے دلدادہ شاعرِ مشرق کی اس پیشن گوئی کا قائل ہو گیا۔ تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔

ابھی ذہنِ مغرب میں فرد اور اجتماع، انسان اور مشین باہم دست و گریباں ہی تھے کہ نازیوں اور فسطائیوں نے یورپ کو دوسری عالمگیر جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا۔ نازیوں نے فرانس کے وجود کو تقریباً ختم ہی کر ڈالا اور اسی فرانس نے ادب کا ایک نیا مکتبِ فکر پیدا کیا جس کا نام ہے وجودیت ہے۔ اس نئے مذہبِ ادب کا دہریہ پیغامبر ہے ژاں پال سارتر جو پیدا تو ہوا ۲۱ جون ۱۹۰۵ء کے دن مگر وجودیت کا اعلان اس نے ۱۹۳۸ء میں کیا۔ وجودیت کے پس منظر میں سُرریلسٹوں کے علاوہ مذکورہ بالا انسانی المیہ نگار تھے، ہیگل اور نطشے کے مرید نازی تھے، ہیگل

اور مارکس کے شاگرد کمیونسٹ تھے اور فرائڈ ژنگ اور ایڈلر کے اہلِ نفسیات کا گروہ تھا۔ وجودیت کے بنیادی عقائد یہ ہیں:—

فرد کا وجود ہی وجود حقیقی ہے

وہ خود اپنا کاتبِ تقدیر ہے۔ کوئی اور قوت و قدرت اس کے اوراء موجود نہیں۔ وہ کسی کا ساختہ پرداختہ نہیں ہے۔ فطرت سماج تاریخ سیاسی اور معاشی نظاموں کے قوانین اور ضابطوں کے دھاروں میں بہنے والا بے بس تنکا نہیں ہے۔ کوئی ماورائے انسانی قوت اس کا تعین نہیں کرتی۔

انسان وہی ہے جو کچھ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔

وجود BECOMING کے مراحل ایک ترغیبی جد وجہد ENGAGEMENT کے ذریعے طے کرتا ہے اور اس طرح اپنی ذات اپنے کردار اور اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔

وجود کے لیے زمان کی سب سے اہم اور عظیم اکائی ہے لمحہ جگ، صدی، عہد وغیرہ سے وہ بے نیاز رہتا ہے اور اپنے آپ کو خطرے یا خسارے میں ڈالے بغیر حال کے لمحے سے پوری طرح فیضیاب لطف اندوز ہونا ہی وجود کا مقصد ہے۔ لمحاتِ گذشتہ کی میٹھی کڑوی یادوں اور لمحاتِ آئندہ کے سیاہ و سفید خوابوں سے وہ اپنے آپ کو آلودہ نہیں کرتا۔

آزادی وجود کا مقدر ہے۔ تمام غیر وجودی بندھنوں سے آزادی جن میں خواہش اور ذمہ داری بھی شامل ہے۔ وجودی ترغیب ایک بے نیازانہ بے لاگ لگاؤ عمل ہے۔ جد وجہد ایک فرض ہے اور دیانت دارانہ اور مخلصانہ جد وجہد کے بعد اگر اس تگ و دو کا محرک بھی ہاتھ سے جاتا رہے[۲] وجود کو محزون و ملول نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس طرح ایک غیر وجودی مصیبت ایک غیر وجودی ذمہ داری کم ہوئی محبوبہ کی آرزو پوری کرنے کی کوشش میں ناکامی کی وجہ سے اگر محبوبہ دوسرے سے شادی کرلے تو رنجیدہ یا غضبناک ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وہ منزل ہے جسے آزادی کہتے ہیں۔

اب اگر وجودیت کے ان عقائد کے ساتھ بدھ مت کی کرونا (करुणा) گیتا کے نشکام کرم (निष्काम कर्म) اور تصوف کی حریت، تجرید، تفرید اور فنا کے نظریات کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو بُعدِ زمانی توڑ کر ایک عجیب مماثلت نظر آئے گی۔ مایا اور متھیا (माया और मिथ्या) سے بر سرِ پیکار آتمن (आत्मन) برھمن (ब्रह्मन) کی طرف رو بہ سفر نظر آئے گی۔ عینیت اور غیریت، بندگی نفس سے نکل جانے اور دنیوی اور دینوی اغراض کو ترک کر دینے اور ہر چیز کو اپنی طرف نسبت نہ دینے کی مقاماتِ سلوک نظر آئیں گے ہاں البتہ ذاتِ حق کے بجائے انا الحق یا ذاتِ خود کا امتیاز ضرور رہے گا۔ یہاں یہ حقیقت

بھی غور طلب ہے کہ بدھ مت کی ابتدا اور عروج کا زمانہ افراتفری کا زمانہ تھا۔ گیتا کا اپدیش مہابھارت کی جنگ کے میدان میں عین جنگ کے دوران میں دیا گیا تھا۔ تصوف کی پیدائش اور افزائش بھی جنگ گزیدہ زوال آمادہ تہذیب کے دور میں ہوئی تھی اور وجودیت کا جنم بھی ایسے ہی حالات میں ہوا ہے۔

بہرحال وجودیت میں ST. AUGUSTINE ! PASCAL ! KIERKGAARD !

NEITZSCHE ! HUSSERL ! KARL JASPER ! HEIDDEGGAR ! SHESTOV !

BERDYAYEV اور ANDRE GIDE کے اثرات تو نمایاں ہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ NATURALISM HUMANISM سے ڈارون کو خارج کر کے فرائڈ کو شامل کر دیا جائے تو نتیجہ کم و بیش وجودیت ہی نکلے گا۔ سارتر کی وجودیت الحادی اور انسانی نظریہ ہے۔ جبرئیل مارسیل رومن کیتھلک عیسائی وجودیت کے علمبردار ہیں اور وجود کی آزادی کے لیے خدا سے ترغیبی رشتہ قائم کرنے کے حق میں ہیں۔

سارتر، مادام سیمون دبیووئی، مالرو، آلبرٹ کامو، مارلیو پونتی، جبرئیل مارسیل سب کے سب نثر نگار ہیں۔ جے۔ ایم۔ کوھن نے جرمن شاعر ہانز خان ساد نگی کو وجودی اضطراب کا شاعر قرار دیا ہے اور اس ایک نام کے علاوہ کسی اور وجودی شاعر کا نام کم از کم میں نے نہیں سنا۔ معلوم نہیں وجودیت شاعری کو کیوں متاثر نہ کر سکی۔ شاید وجودی حقیقت افسانوی اور تمثیل پیکروں ہی کی محتاج ہے۔

وجودیت ہمارے زمانے کا ایک نہایت اہم مکتب فکر و فن ہے اور وجودی ادیب کامو کو نوبل انعام سے بھی نوازا گیا ہے مگر مجھے وجودی افسانوں ناولوں اور ڈراموں کے کردار اپیل نہیں کرتے وہ جستجو تو کرتے ہیں مگر آرزو کی ان کے ہاں کوئی وقعت نہیں حفظِ وجود میں کامیابی سے بڑا ان کے نزدیک کوئی اور کارنامہ ہی نہیں ہے حتیٰ کہ حصولِ مقصد میں ناکام ہو کر محرکِ جستجو کو کھو کر بھی اپنے وجود کی خیر منانا اور آزادی کا اعلان کرنا ان کیلئے اصل الوجود ہے عجیب پرپاتے ہوئے، مرگھلے، بزدل اور نامستعد کردار ہوتے ہیں۔ گھانی کے بیل کی طرح گھوم پھر کر وہیں آجاتے ہیں جہاں سے چلے تھے اور چلانے والے کو نہ پاکر خوش ہو جاتے ہیں۔ سرّیلزم کے صرف دل تھا وجودیت کے صرف دماغ ہے۔ اُسے گوشۂ عافیت اور حجرۂ تنہائی پسند تھا اُسے ذوقِ آوارگی ہے۔ وہ محاضرے کی قائل تھی یہ مکاشفے کی دلدادہ ہے۔ دل، دماغ اور روح میں توازن — محاضرات، مکاشفات اور مشاہدات[1] کا تناسب قائم رکھنا دونوں کے بس میں نہیں ہے — اور یہ توازن اور تناسب ادیب اور فنکار کے لیے از بس ضروری ہے۔ ★

---

[1] محاضرہ مکاشفہ اور مشاہدہ تصوف کی اصطلاحات ہیں۔ محاضرہ یعنی تجلی موذات بالقلب مکاشفہ یعنی تجلی صفات بالسر اور مشاہدہ یعنی تجلی ذات بالروح۔ انھیں بآسانی INTELLECTUAL ، EMOTIONAL اور SPIRITUAL عرفانی حق کہا جا سکتا ہے۔

پروفیسر شور

O

کوئی ہجوم ہو تیری ہی بزمِ خلوت ہے
یہ حادثہ بھی ترے شہر میں غنیمت ہے

رہینِ سجدہ ہے کب سے ترے جنوں کا غرور
ترے خیال سے کیا کیا مجھے ندامت ہے

کھنک سے جام کی ٹوٹے ہیں کتنے دل یہ دیکھ
یہ بےخودی تو نہیں، بےخودی کی تہمت ہے

غرورِ شوق نے پہنچا دیا وہاں کہ جہاں
سجودِ شوق بھی پیشانیوں کی ذلّت ہے

اُٹھا سکے تو اُٹھا حکمت و جنوں کا حجاب
میں ہنس رہا ہوں کہ ہنسنا تو میری عادت ہے

خجالتِ غمِ تعمیرِ آشیاں مت پوچھ
مجھے تو دیر سے برقِ تپاں کی حسرت ہے

ہے میری چپ پہ بھی اے شورؔ گفتگو کا گماں
صلیب و دار کو اس کی بھی کیا ضرورت ہے!

مجید امجد

O

جو ہو سکے تو مرے دل، اب اک وہ قصّا بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی
کبھی سفر ہی سفر میں، جو عمرِ رفتہ کی سمت
پلٹ کے دیکھا تو اُڑتی تھی گردِ فردا بھی
مرے وجود میں ہیں جتنے موسم، اُن کو کبھی
رُتوں کے رَس میں بجھے سایو، تم نے دیکھا بھی
بڑے سلیقے سے، دنیا نے میرے دل کو دیے
وہ گھاؤ، جن میں تھا سچّائیوں کا چرکا بھی
کسی کی روح سے تھا ربط، اور اپنے حِصّے بھی
وہ بے کلی، جو ہے موجِ زماں کا حصّا بھی
یہ آنکھیں، ہنستی وفائیں، یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی
یہ رسم، حاصلِ دنیا ہے، اک یہ رسمِ سلوک
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی
دِلوں کی آنچ سے تھا برف کی سلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینا بھی
مجھے ڈھکی چھپی، ان بوجھی، اُلجھنوں سے ملا
کچی تُلی ہوئی اک سانس کا بھروسا بھی

کبھی کبھی، انہی اُلھڑ ہواؤں میں امجد
سُنا ہے دور کے اک دیس کا سندیسا بھی

رزم ردولوی

○

اندھیر کچھ ایسا ہے کہ ٹالا نہیں جاتا
پھر بھی دلِ بینا سے اُجالا نہیں جاتا

کیا پاؤں پکڑ رکھتے ہیں ساحل کی زمیں نے
کیا ڈوبنے والے کو نکالا نہیں جاتا

جس کلمۂ حق کے لیے خوں پانی ہوا ایک
کیوں حلق کے نیچے وہ نوالا نہیں جاتا

کیا کہیئے نئی روشنی کے عہد کا اندھیر
ویرانۂ دل تک یہ اُجالا نہیں جاتا

بدنام کیا جس طرح آثارِ وفا کو
یوں عیب بھی دنیا میں اُچھالا نہیں جاتا

تابانیٔ کردار ہے وہ کشتۂ غم کی
بجھ جائے جو یہ شمع اُجالا نہیں جاتا

یہ تیز روی قافلۂ شوق کی توبہ
گرتے ہوئے ساتھی کو سنبھالا نہیں جاتا

چھپ جاتے ہیں انوارِ مہ و مہر مگر رزم
داغِ غمِ اُلفت کا اُجالا نہیں جاتا

ارشاد حسین کاظمی

اس طرح کا شہر میں پہلے تو سناٹا نہ تھا
اتنے لوگوں میں کبھی میں اس قدر تنہا نہ تھا

صحنِ گلشن سے گزر اپنا تھا جھونکے کی طرح
وہ بھی کیا دن تھے کہ احساسِ طلب ہوتا نہ تھا

آج یوں سونی پڑی ہیں دل کی ویراں بستیاں
جیسے ان گلیوں سے کوئی راہ رو گذرا نہ تھا

بجھ گئی وہ شمع دل میں جو کبھی روشن نہ تھی
اب وہ بیگانہ ہوا ہے جو کبھی اپنا نہ تھا

پھول کیسے گھاس کی پتّی بھی اب باقی نہیں
دوستو یوں تو کبھی ابرِ کرم برسا نہ تھا

مدّتوں زینے بنائے سگرٹوں کی آگ سے
اپنے اندر سے نکلنے کا مگر رستا نہ تھا

اجنبی بن کر وہ گذری آج میرے پاس سے
دل سے اب کہتا ہوں اُس نے مجھ کو پہچانا نہ تھا

گھر بناتا تھا ہوا میں اپنی خوشبوؤں میں گم
— ان دنوں لیکن ابھی میں شاخ سے ٹوٹا نہ تھا

یاد ہے ارشاد اس سے آشنائی جب ہوئی
لوگ سمجھاتے تھے تجھ کو اور تو سنتا نہ تھا!

اختر ہوشیارپوری

○

صبح تک جلتے رہے شام سے ہم
کیا کہیں شعلۂ بے نام سے ہم
چاند اُبھرا تو زباں گنگ ہوئی
باتیں کرتے تھے در و بام سے ہم
رُک گیا وقت مرے دل کی طرح
ڈر گئے دورِ مے و جام سے ہم
پھرتے ہیں شہر میں تنہا تنہا
باز آئے دلِ بدنام سے ہم
لوگ ہم سے تجھے پہچان گئے
تھے جو وابستہ ترے نام سے ہم
دامنِ دل ہے اور اک عمر کی گرد
پھرتے ہیں گردشِ ایّام سے ہم
یوں جلاتے ہیں سرِ راہ چراغ
جیسے بیگانہ ہوں انجام سے ہم
دن کو خورشید ہے شب کو اختر
کیا چھپیں گے نگہِ عام سے ہم

جمیل ملک

○

شعر آغاز کریں بھی تو کہاں سے پہلے
ہونٹ سِل جاتے ہیں اظہارِ بیاں سے پہلے

غمِ دُنیا سے کب انکار ہے لیکن لوگو
غمِ دُنیا بھی کہاں تھا غمِ جاں سے پہلے

اِس مسافر پہ یقیں آئے نہ آئے تم کو
پوچھ لو حال مرا ہم سفراں سے پہلے

اُن کی نظروں میں سُبک اتنے ہوئے ہیں کہ نہ پوچھ
ہم کہ رہتے تھے بڑے تند و گراں سے پہلے

ختم ہوتی ہے بہرحال ہمیں پر آکر
بات چلتی ہے اگر کوئی وہاں سے پہلے

بار گزرا ہے جمیلؔ اُن پہ یہ اندازِ غزل
پوچھ لینا تھا ذرا طبعِ رواں سے پہلے

رفیق خاور جسکانی

○

روکشِ صبح! مرا دیدۂ تر ہو جیسے
آج کی شب مرے اشکوں سے سحر ہو جیسے

چاند سی صورتیں دیکھی ہیں سرِ بزمِ خیال
دلِ وارفتہ کوئی آئینہ گر ہو جیسے

اسکے اشک آج بھی سینے پہ سلگ اٹھتے ہیں
مرے شانے پہ وہی جنبشِ سر ہو جیسے

دل کو پھر اس کی پشیماں نگہی یاد آئی
میرے بازو پہ وہی شعلۂ تر ہو جیسے

اشکِ لرزاں کا وہ آنکھوں سے ڈھلکنے کا سماں
بے زباں ہم سا کوئی شہر بدر ہو جیسے

چاند بھی سینۂ آفاق کا دل لگتا ہے
سونا سونا کوئی کرنوں کا نگر ہو جیسے

تیرتے رہتے ہیں یادوں کے سفینے آہیں
چاندنی رات بھی دریا کا سفر ہو جیسے

اسکی آنکھوں میں کچھ اس طرح اتر ڈھونڈتا ہوں
اس کو میرے غمِ پنہاں کی خبر ہو جیسے

جنابِ مُنوّر لکھنوی کی دوسری اہم تصانیف و تالیفات

۱۔ بھگوت گیتا منظوم موسوم بہ نسیمِ عرفان
اردو میں اس سے بہتر بھگوت گیتا کا شعری ترجمہ مشکل سے ملے گا قیمت تین روپے علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

۲۔ شکنتلا
کالی داس کے شہرۂ آفاق ڈرامے کا تازہ ترین معیاری ترجمہ قیمت چھ روپے علاوہ محصولڈاک وغیرہ

۳۔ وجدانِ حافظ
خواجہ حافظ کے کئی سو فارسی اشعار کا بہترین شعری ترجمہ جسے انجمن ترقی اردو بک ڈپو دہلی نے شائع کیا ہے قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے ۔ علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

۴۔ نوائے کفر
جنابِ منوّر لکھنوی کی منتخب غزلوں کا مجموعہ. قیمت دو روپے پچاس پیسے. علاوہ محصولڈاک وغیرہ

۵۔ ادائے کفر
جنابِ مُنوّر لکھنوی کی منتخب غزلوں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے. علاوہ محصولڈاک وغیرہ

۶۔ ساگر سنگیت موسومہ بحرِ ترنم
بنگال کے مشہور محبِ وطن سی آر داس مرحوم کی لازوال روحانی تصنیف کا ترجمہ نثر میں. قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے. علاوہ محصولڈاک وغیرہ

۷۔ اودھوت کا ترانہ یا نغمہ قلندری
سوامی شنکراچاریہ کی سنسکرت نظم کا شعری اردو ترجمہ قیمت: ۲۵ پیسے ——— علاوہ محصولڈاک وغیرہ

۸۔ روحانی مکالمہ
سوامی شنکراچاریہ کی سنسکرت نظم کا شعری اردو ترجمہ قیمت ، ۳ پیسے علاوہ محصولڈاک وغیرہ

۹۔ گجبندر موکھش یا دُکھی کی فریاد
ایک سنسکرت نظم کا شعری ترجمہ قیمت ، ۳ پیسے علاوہ محصولڈاک وغیرہ

۱۰۔ گیت گووند یا سرمدی نغمے
شاعرِ کامل بھگت راج جے دیو کی مشہور سنسکرت تصنیف کا اردو میں شعری ترجمہ اس لازوال تصنیف کا اردو ادب میں پہلا شعری ترجمہ ہے قیمت تین روپے علاوہ محصولڈاک وغیرہ

کمار سمبھو
کالی داس کے ایک شاہکار کا شعری ترجمہ. قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک وغیرہ

۱۱۔ صدر کی گیتا
یعنی حضرت منور لکھنوی کے خسر علامہ منشی بچھن پرشاد صدر لکھنوی کا پیش کیا ہوا فیضی کی فارسی گیتا کا شعری ترجمہ. قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک وغیرہ

یہ کتابیں ہند و پاک کے تمام کتب فروشوں سے بھی مل سکتی ہیں

ملنے کا پتہ

آدرش کتاب گھر ۲۹-۱۵۲۸ فیض گنج ، دریاگنج ، دہلی

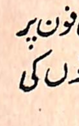
بھارتی زبانوں میں تار

آپ بھارت کی
کسی بھی زبان
میں
تار بھیج سکتے ہیں
بشرطیکہ
پیغام
دیوناگری رسم الخط
میں ہو

انگریزی میں تار بھیجنے کے لئے جو سہولیات دستیاب ہیں، اب وہ دیوناگری رسم الخط میں تار بھیجنے کے لئے بھی حاصل ہیں۔ تہنیتی تار (مبارک باد کے جملے ہندی میں) ڈی لکس تار،

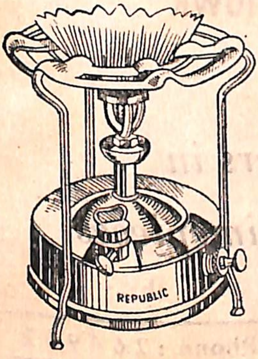
اخباری تار، بیماری و حادثے کے ترجیحی تار (پرائرٹی ہیومن لائف ٹیلی گرام) ٹیلی فون پر تار (فونوگرام) اور تار کے مختصر پتوں کی رجسٹریشن۔

یہ سروس اب ۲۰۰۰
تار گھروں میں دستیاب ہے



محکمہ ڈاک و تار

DA 63/478



REPUBLIC